DAMAGE BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222167
UNIVERSAL
LIBRARY

OUP—901—26-3-70—5,000

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۴۳۳۳ Accession No. ۱۶۵۰۵
ر ل 16505

Author رشید اختر ندوی

Title رش نے محبت کی

This book should be returned on or before the date last marked below.

پنجاب کے ایک سیاست دان مسٹر ممتاز
دولتانہ کے نام ان کی ذہانت سے متاثر ہو کر
ان کی اجازت اور تعارف کے بغیر....

رشید اختر ندوی

جن لوگوں نے نزہت کا بچپن دیکھا وہ جانتے تھے کہ نزہت کے باوا سر وجاہت عالم کے بی۔ ای۔ آئی۔ او۔۔۔ ہر اس شخص کو جان سے مار دینے پر تیار ہو جاتے جو نزہت کے سامنے غم کی باتیں کرنے کی کوشش کرتا۔ سر وجاہت عالم پچپن برس کے ہونے کے باوجود خود اپنی اس بچی کے سامنے، ہمیشہ یوں قہقہے لگاتے جیسے وہ بیس اکیس برس کے جوان رعنا تھے۔ یہ تو سر وجاہت عالم ہی خوب سمجھتے تھے کہ ان کے اس طریق کار کا سبب کیا تھا۔ وہ اپنی اس اکلوتی بچی کو غم سے کیوں ناآشنا رکھنا چاہتے تھے۔ وہ کیوں اسے زندگی کے اس ایک ہی رخ سے واقف کرنے پر مصر تھے۔ بہرحال یہ حقیقت تھی اور سر وجاہت عالم کے گھر میں آنے جانے والے کو اس سے پوری آگاہی تھی۔ گو سر وجاہت عالم دو سال ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ مگر اس آنے والے ہر شخص کو یہاں کا چلن معلوم تھا۔ اور نزہت کی بھرپور جوانی اور شغل مے نوشی نے گویا اسے سائن بورڈ کی صورت دیکر اپنے بنگلے کے ہر چبوترے اور دیوار پر چسپاں کر دیا تھا۔

آزاد، اونچے اور دولت مند ماحول میں تربیت پانے اور جوان ہونے والی اس نزہت نے، اپنے جیسے امیر گھرانوں کی جوان لڑکیوں، بڑے انگریزوں، میم صاحبوں اور مسوں کے ساتھ رہ کر، جہاں، تخیل اور عمل میں آزادی سیکھی تھی وہاں، یہ بات بھی جانی تھی کہ ہر وہ چیز جائز اور مباح ہے۔ جسے دولت خرید سکے یا جہاں تک ہمارے ہاتھ پہنچ سکیں۔

اس کے ہاں مامائیں بھی تھیں۔ مانگنے والی غریب عورتیں بھی قریب قریب روزانہ اسکے دروازے پر دستک دیتیں۔ وہ خود بھی موٹر میں بیٹھ کر جب کبھی سیر کو نکلتی، اور شہر میں پھرتی تو اس ملک کے غریب اور مفلس لوگوں کو دیکھتی۔ مگر اس کی توجہ کبھی ان پر نہ ہوئی، اس نے کبھی ان کا حال جاننے کی کوشش نہ کی۔ پر یہ زمرد، جس کا نام موتیوں کے خاندان میں

سے تھا۔ اور لباس کسی کباڑیئے کی دوکان سے خرید ا ہوُا نظر آتا تھا نہ جانے کس متقاطیسیت کی مالک تھی کہ نزہت نے شرابی ہونے کے باوجود اس کا حال، اس کا ماضی اور ماضی کی ہر بات پہلی ملاقات میں جان لینی چاہی۔ اس میں کوئی کلام نہیں۔ اس زمرد کو نزہت کے پاس لانے والا میجر منو۔ نزہت کے ہم پلہ خاندان کا فرد تھا۔ لیکن یہ زمرد تو اس کے ہم پلہ نہ تھی۔ یہ تو گندی نالیوں میں رینگنے والی مخلوق تھی۔ یہ تو اس طبقہ میں پیدا ہوئی تھی، جو نزہت اور اس کے ہم جولیوں کے نزدیک مُنہ لگانے کے قابل نہ تھا۔ یہ تو زیادہ سے زیادہ، نزہت کی جوتیاں صاف کرنے، اس کے لباس کی شکنیں دور کرنے اور اس کے بستر پر پھول پھیلانے کا کام کرسکتی تھی۔ مگر اسے میجر منو میاں اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس لئے نزہت نے اسے اپنے پہلو میں بٹھا لیا تھا۔ یہ تو ذرا بعد میں پتہ چلا کہ زمرد نچلے طبقہ کی فرد ہونے کے باوجود واقعتاً بڑی "انٹرسسٹنگ" تھی۔ اور اسکے آنسو اور آہیں تو اپنے اندر بڑی متقاطیسیت رکھتے تھے۔

اور اب جبکہ بیتی ہوئی رات کے بعد آنے والے اس دن کے دو بج رہے تھے اور وہ اپنے بستر پر کروٹیں ہی بدلتی چلی جارہی تھی۔ اسے یہ زمرد بہت یاد آرہی تھی۔ اور اس کا جی چاہ رہا تھا کسی طرح یہ زمرد پھر اس کے پاس آجائے اور وہ اس سے پوچھے زمرد بیگم۔ کیا آنسو آہیں بھی زندگی گزارنے کے لئے ویسے ہی لازمی ہیں۔ جیسے، قہقہے، رقص وسرور اور مے ونغمہ۔

مگر اسے زمرد کا پتہ معلوم نہ تھا۔ میجر منو میاں حسب عادت چھلاوے کی طرح کتنے دنوں کے بعد تشریف لائے تھے۔ اور اس نئی مخلوق کو اس کے پہلو میں بٹھا کر معذرت کئے بغیر ہاؤں بھاگ گئے تھے۔ جیسے باہر سڑک پر لام پر کر جانے والا دستہ ان کے

انتظار میں کھڑا تھا۔

نزہت نے صبح سے چائے نہیں پی تھی۔ زیادہ دیر رات تک جاگنے اور معمول سے زیادہ پی لینے کے سبب، اسے کچھ کھانے یا پینے کی خواہش نہ تھی۔ پھر اسے یہ گہری گہری زرد آنکھوں والی زمرد تخیل ہی تخیل میں اپنے پہلو میں لیٹی آنسو بہاتی اور آہیں بھرا محسوس ہو رہی تھی۔ اور گویا اس سے ایک عجیب والاویزی، انوکھی متناطیسیت اور درد بھرے انداز میں برابر کہے جا رہی تھی۔

نزہت بی بی۔ تم بڑے خاندان میں پیدا ہونے پر جتنا چاہو فخر کر سکتی ہو، تم اپنی دولت، اپنے آرام، اپنے سکون اور ماحول پر ناز کرنا چاہو تو میں تمہیں روک نہیں سکتی لیکن یہ بات ذہن نشین کر لو کہ تمہاری یہ زندگی مکمل نہیں ہے۔ ادھوری ہے۔ زندگی کی تکمیل چاہتی ہو۔ تو میری طرح آہیں بھرنا اور آنسو بہانا سیکھو۔

نزہت اس کی اس پکار کو برابر سن رہی تھی۔ مگر وہ کس طرح آنسو بہاتی کس طرح آہیں بھرتی۔ یہ تو ایک بڑا مشکل فن تھا۔ اسے تو ہنسنے اور خوش رہنے کی کچھ ایسی عادت ہو چکی تھی کہ جب اس کو ہر لمحہ خوش رکھنے والے سر وجاہت عالم کا انتقال ہوا۔ تو اس وقت بھی وہ آنسو نہ بہا سکی۔ اور ڈاکٹر لفٹننٹ کرنیل نواز جنگ بہادر کے گریبان سے کھیلتی ہوئی۔ روندھے ہوئے گلے کے ساتھ ان سے پوچھنے لگی۔

بابا نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی۔ اگر ہم ان کی موت پر رو دئے تو وہ ہمیں کبھی معاف نہ کریں گے۔ یہ ان کے مشن کی توہین ہوگی۔ یہ ان کے آدرش، ان کے مقصود حیات اور نہ جانے کس کس اصول کی صریحاً مخالفت تصور کی جائیگی۔ کیا میں

اگر [illegible]

ڈاکٹر لفٹننٹ کرنیل نواز جنگ بہادر نے جو اس کے باپ کے گہرے دوستوں میں سے ایک تھے۔ اس کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔
بیٹی! آنسو بہانا بزدلوں کا کام ہے۔ تمہارے باپ تم سے یقیناً خوش نہ ہونگے اگر تم ذرا بھی روئیں۔

نزہت نے رونے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ اور میجر منو میاں سے جو لفٹننٹ کرنیل نواز جنگ کا پیارا بھانجہ تھا۔ باپ کی دلچسپ باتیں کرنے لگی تھی۔ یہ فطری بات تھی کہ جب وہ اپنی توجہ کو اس طرح بٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا دل اندر ہی اندر پکی ہوئی ہنڈیا کی طرح ابل رہا تھا۔ مگر سر وجاہت عالم کا خون نہ جانے اتنا کیوں گرم تھا۔ کہ وہ باتیں کرتی رہی۔ اور دل اندر ہی اندر جلتا رہا۔ غم کا یہ موقعہ بھی روئے بغیر گزر گیا۔
لیکن آج یوں لیٹے لیٹے اس کا جی اس بالکل نئی بات کے لئے چاہنے لگا۔ اسے خواہش پیدا ہوئی۔ وہ روئے اور خوب جی کھول کر روئے۔ مگر رونا کوئی مذاق تو تھا نہیں کوئی برج کا کھیل نہ تھا۔ کہ پتے ہاتھ میں لئے اور شروع ہو گیا۔ یا پیانو نہ تھا کہ انگلیاں رکھیں اور تار بج اٹھے۔

دل کی مثال یقیناً رباب کی ہے۔ یقیناً اس کے تار ساز کے تاروں سے مشابہ ہیں۔ مگر دل کا یہ ساز ہر دوسرے ساز کی طرح مضراب کا محتاج ہے۔ اور غم کے سوا، کوئی دوسرا مضراب نہیں ہے۔ یہ غم ہی ہے۔ جس سے دل کا ساز بجتا ہے۔
نزہت غم سے آشنا نہ تھی۔ اس لئے اس کے دل کے تار بج نہ سکے۔ اور آنسو بہ نہ سکے۔ اچانک۔ بڑی بی نے اندر قدم رکھا۔ اور اپنی ٹیڑھی کمر کو کسی قدر سیدھا کرتے ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ رت بنو سے کہا۔

نزہت بیٹی، دس بجنے کو ہیں اور تم آج اُٹھ ہی نہیں رہیں۔ چائے کا ایک گھونٹ تک نہیں پیا۔ کلی تک نہیں کی۔ منہ تک نہیں دھویا۔ میجر منّو میاں دو بار پوچھ چکے ہیں کیا ابھی سو کر نہیں اُٹھیں۔

بڑی بی نے میجر منّو کا نام کیا لیا۔ نزہت دیوان سے اس طرح اُٹھ بیٹھی جیسے دیوان کے اسپرنگ آپ ہی آپ اپنی اصلی لچک سے کئی گنا زیادہ لچکیلے ہو گئے تھے اور انہوں نے اس نزہت کو بہت زور سے اوپر کو اچھال دیا تھا۔

نزہت نے اوپر اُٹھتے ہی اوڑھنی سنبھالے بغیر بڑے کمرے کا [illegible] کرنیل نواز جنگ بہادر کا نمبر ملاتے ہوئے پوچھا۔

کیا میجر منّو گھر پر ہیں۔

ادھر سے وہی جواب آیا جو اس چھلاوے کے متعلق دیا جا سکتا تھا۔ منّو میاں باہر گئے ہیں۔

نزہت نے دوسرا سوال کیا۔

کب تک لوٹیں گے۔

جواب ملا، یہ کیسے کہا جا سکتا ہے بی صاحبہ!

پرنس میجر منّو کے متعلق اس کے گھر کا اسٹاف یہ خبر کیسے دے سکتا تھا۔ کہ حضرت میاں صاحب کب لوٹیں گے۔ اس سے تو یہ اُمید بھی نہ کی جا سکتی کہ وہ آج گھر لوٹ کر آئے گا بھی یا نہیں۔ اور اگر آئے گا تو اس کی واپسی میں دن لگیں گے یا ہفتے۔

نزہت جہاں بیگم کو یہ بات خود بھی معلوم تھی۔ اس لئے وہ اپنے اس سوال کی بیہودگی پر آپ ہی [illegible]۔ اور ٹیلیفون کا سلسلہ کاٹ کر چھتری [illegible] جواب [illegible] سے

بی نقرئی آواز میں پوچھا۔

ارشاد حضور!

نزہت کو اس کے اس "ارشاد حضور" سے بڑی نفرت تھی۔ مگر اس لمحہ وہ کسی ورہ الجھاؤ میں الجھی تھی۔ اس نے اس "ارشاد حضور" پر اعتراض کئے بغیر پوچھا۔

کیا تمہارے ہاں میجر متو میاں تو نہیں آئے۔

چھمی نے آواز پہچان کر طنز کی۔

اچھا تو یہ نزہت جہاں بیگم اپنے اللہ دے چہیتے متو میاں کی ڈائری خیر دن سے لے رہی ہیں۔ حالانکہ ہم غریبوں نے متو میاں کو تین دن سے متواتر نہیں دیکھا۔

نزہت کا عالم اس وقت ایسا نہ تھا جو اس چھمی کی کسی بات پر معترض ہوتی۔ ورنہ وہ اس سے کہہ سکتی تھی۔ بی صاحبہ یہ آپ چھلنی ہو کر چھاج کو طعنے دے رہی ہیں متو میاں کی چہیتی آپ ہیں یا یہ ناچیز۔ متو میاں کو سر پہ آپ نے چڑھا رکھا ہے۔ اس کے سوٹ آپ سلواتی ہیں یا یہ بندی، اسکے بل آپ ادا کرتی ہیں یا یہ خادمہ!

مگر اس نے اس چھمی سے کچھ بھی تو نہ کہا۔ اور سلسلہ آپ ہی آپ کاٹ کر لفٹنٹ کرنیل کرم سنگھ کی لاڈلی بہن سورن لتا کا نمبر ملا کر میجر متو کی خیریت دریافت کی۔

سورن لتا گھر پر نہ تھی۔ اس کی ماتا جی بولیں۔

بیٹی، سورن تو نوزی کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی ہے۔ آئیگی تو تمہارے ہاں بھیج دوں گی۔ لیکن اسے جلد ہی لوٹا دینا۔ رات کو وہ جب آئی تو بہت دیر ہو چکی تھی اور بہت بہکی بہکی سی باتیں کر رہی تھی۔

سے [illegible] بلبلا۔

نوکری سے علیحدگی، ہزاروں غموں جتنا بڑا غم تھا۔ یہ تو کوہ ہمالیہ سے بھی زیادہ وزنی تھا۔ اس کے تصور ہی سے وہ لرز اٹھی اور سر مرحوم سے اقرار کیا۔

نہیں عالی جاہ ایسی بات کبھی نہ ہوگی۔

اس دن کے بعد سے آج دن تک وہ اس گھر میں ہر لمحہ خوشی خوشی رہی۔ ہر لمحہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی روشنی پھیلی نظر آئی۔ اور اس وقت جب اس نزہت نے اس سے یہ بات پوچھی تو اس نے جھوٹ بولا۔

نہیں سرکار۔ ہم تو زندگی بھر کبھی نہیں روئیں۔ نہ کبھی آنسو ہی بہائے ہیں۔ آنسو بہانا بھی کوئی، شریفانہ فعل ہے۔ رونا بھی کوئی عقلمندی ہے۔ روتے تو وہ ہیں جو سر سے لے کر پیر تک احمق ہوتے ہیں۔

نزہت نے زور کا قہقہہ مارا اور نجم کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے رازداری کے انداز میں کہنے لگی۔

اری نجم۔ تجھ سے سچ کہیں، کتنی دیر سے ہم بیٹھے بیٹھے، رونے اور آنسو بہانے کی خواہش کر رہی تھیں۔ رات وہ میجر منو کے ساتھ ایک خوبصورت سی چھوکری آئی تھی نا جس کی آنکھیں زرد زرد اور لانبی لانبی سی تھیں۔ وہ جب تک میرے پاس رہی روتی رہی۔ اور مجھے اس کا رونا بڑا بھلا لگا۔ میرا بھی جی چاہا۔ میں بھی رو کر دیکھوں۔

نجم ظالم نزہت سے دگنا قہقہہ مار کر ہنسی اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے۔ عجیب دیوانوں کی طرح ناچنے لگی۔ وہ ناچتی جاتی اور چیختی جاتی۔

اری او نوکری پیشہ لڑکیو ادھر آؤ، تمہیں ایک عجیب بات سنائیں۔

اللہ قسم سنو گی تو تم سب بھی اسی طرح ناچنے اور گانے لگو گی جیسے ہم ناچ رہی ہیں۔

نزہت کا جی چاہا اس احمق کی گردن فوراً دبا دے اور اس کے ناچتے اور تھرکتے جسم کو اپنے پاؤں کے نیچے داب کر چیخے۔

گدھی کہیں کی۔ ہم نے تم سے یہ کب کہا تھا کہ تم ہماری یہ حماقت سب لوگوں سے کہہ دو۔ مگر ساری نوکرانیاں جو اللہ کے فضل اور دولت کی مہربانی سے ایک درجن سے کم نہ تھیں۔ اور سب کی سب ہنس مکھ۔ طرحدار اور جوان تھیں۔ اس ناچتی کوئل کے پاس آن جمع ہوئیں۔ اور بی بی سے ہنس ہنس کر آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھنے لگیں۔

سرکار نے کیا آج پھر اس شریر چھوکری کو شمپئین پلا دی ہے۔ جو یہ آپے سے باہر ہو رہی ہے۔

مگر یہ شریر چھوکری پیئے بغیر ناچ رہی تھی۔ اور ان سب سے تالیاں پیٹ پیٹ کر کہنے لگی تھی۔

اری کچھ سنا تم نے بھی ہماری سرکار آج اس گھر کی سب سے مقدس، سب سے بڑی اور سب سے زیادہ سنگین رسم کو آپ ہی توڑے دے رہی تھیں۔ یہ آپ آج رونے اور آنسو بہانے کا ارادہ کئے تھیں۔

اور لڑکیاں، نزہت کے اضطراب کے باوجود، بگُل کی طرح ہنسنے، ناچنے اور قہقہے لگانے لگیں، نزہت جھنجھلانے کو تھی۔ اس کا پیمانۂ ضبط چھلکنے کو تھا۔ مگر ان ناچتی لڑکیوں اور قہقہے لگاتی جوانیوں کو دیکھ کر اسے اپنے باوا ایک بار پھر یاد آگئے تھے۔

یہ اس کے باوا ہی کی تعلیم تھی کہ یہ لڑکیاں اس طرح اس کی اس بات کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ وہ بھی تو اسی طرح کرتے۔ نہ صرف کرتے بلکہ اس فوج کی فوج لڑکیوں اور سارے مرد ملازموں سے جوان چھوکریوں سے تھوڑے ہی کم تھے۔ اسی قسم کی حرکتیں کروایا کرتے۔ جیسے بھی کوئی لڑکی یا کوئی نوکر چھوکرا مسکرائے بغیر ان کے سامنے آتا۔ وہ ساری کی ساری

فوج کو بلاکر حکم دیتے۔ اس کا مذاق اڑاؤ، اور اسے بیچ میں لیکر یوں ناچو جیسے وہ اس وقت ناچ رہی تھیں۔ اس وقت ذرا فرق یہ تھا کہ انہوں نے نزہت کی حیثیت کا لحاظ کرکے اسے بیچ میں نہیں لیا تھا۔

یادا کی بات کیا یاد آئی، وہ آپ بھی دیوانہ وار ہنسنے لگی۔ بڑی بی نے دروازہ کا پردہ ہٹاکر، ان احمق لڑکیوں کو اس طرح ناچتے دیکھا۔ تو زور سے چیخی۔

احمقو یہ تمہیں آج اچانک اس طرح ناچنے کی کیا سوجھی ہے۔ یہاں بڑے سرکار نہیں ہیں کہ تمہیں انعام دیں گے۔ یہ دنیا اب کچھ بدلتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ مطلع اب کچھ دھندلانے لگا ہے۔

بڑی بی کو ابھی تک نزہت کے چہرے کی وہ متانت اور سنجیدگی نہ بھولی تھی۔ جس سے آج اس نے اس کا استقبال کیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا۔ یہ نزہت بھی ان میں شامل تھی۔ اور ان ہی کی طرح ہنس رہی تھی۔ نزہت نے اس کی یہ بات سنی، تو سامنے آگئی۔ اور ان ہی کی طرح اچھلتے ہوئے بڑی بی کو جواب دیا۔

بڑی بی۔ بڑے سرکار نہیں ہیں تو کیا ہوا، ہم خود آج ان سب کو ایک ایک ریشمی ساڑھی انعام دیں گی۔ اور ہر ایک کی تنخواہ میں پانچ پانچ روپے ماہوار کا اضافہ کر دینگی یہ پہلا اضافہ تھا۔ یہ پہلا انعام تھا۔ جو بڑی سرکار کے مرنے کے بعد ان نوکرانیوں کے حصہ میں آیا تھا۔ ورنہ جب سے مرحوم بڑی سرکار اس دنیا سے سدھاری تھیں۔ ان کی تنخواہیں ایک ہی جگہ جم کر رہ گئی تھیں۔ اور ایسا نظر آتا تھا کہ یہ آخر تک ایسی ہی رہیں گی نزہت نے یہ حد توڑ ڈالی۔ تو سب نے مل کر دفعتاً ناچنا بند کر دیا اور جہاں تھیں وہیں کی وہیں رکوع کے بل جھک گئیں۔ اور حیدر آبادی اونچے گھرانوں کی نوکرانیوں کی طرح

فرشی سلام کرنے لگیں۔

یہ عادت بھی سرمرحوم ہی کی عطا تھی۔ وہ حیدرآباد میں برسوں رہے تھے۔ اور نوکروں میں اس عادت کو اس درجہ راسخ کر دیا تھا۔ کہ ان کا بنگلہ نظام دکن کا بیرونی محل معلوم ہوتا تھا۔

نزہت نے ان کو اس طرح فرشی سلام کرتے پایا تو ... اتنا بھلا معلوم ہوا کہ اسکا جی چاہا۔ پانچ پانچ روپے ماہوار کے مزید اضافے کا اعلان کر دے اور اپنے جی کی یہ خواہش جب وہ زبان پہ لائی تو لڑکیوں نے رکوع ... ہٹ کر اپنے گھٹنے زمین پر ٹیک دئے۔ اور اپنے ماتھے اس نزہت کے سامنے جھکا کر اپنے نازک ہاتھ اپنی پیشانیوں پر لے گئیں۔ یہ ادا یقیناً بڑی ہی جاذب نظر تھی۔ مگر یہ اس ذہنی جلا کے قطعاً منافی تھی۔ جو نزہت کو نئے لٹریچر کے مطالعے سے ملی تھی اور اس نے ان سب کو ڈانٹا۔

بیٹی اگر تم نے یہ حرکت چند لمحے اور جاری رکھی تو ہم انعام بھی واپس لے لینگی اور تنخواہ میں اضافہ بھی نہیں کریں گی۔ ہمیں یہ آداب ... سامنے گھٹنوں کے بل جھکنے کی رسم بہت بری لگتی ہے۔

بس وہ جھک جھک کر سلام ٹھیک تھا۔ اس وقت ذہن نے جو مسرت پائی، تمہاری اس حرکت نے وہ سب ہم سے چھین لی۔

وہ خواہ کتنی شوخ تھیں، خواہ کیسی ہنس مکھ تھیں، خواہ کیسی بے باک تھیں مگر تھیں تو اس طبقہ کی جسے اونچے سماج میں نچلا طبقہ کہا جاتا ہے۔ اور جسکی معاشی حالت سرمایہ دار سماج کے سبب کبھی بھی ایسی اچھی نہیں ہوتی کہ پانچ دس روپے ماہوار اضافہ کی خوشخبری کو کوئی اہمیت نہ دے۔

نزہت نے یہ بات کیا کہی ساری کی ساری لڑکیاں سرد قد اسطرح کھڑی ہو گئیں۔ جیسے کسی زلزلے سے ڈرا دی گئی تھیں ان کے چہروں پر چھائی مسرت کافور ہو گئی۔ ان سب کے چہرے یوں ماند پڑ گئے تھے۔ جیسے پوڈر کے دھلنے سے نئے طبقہ کی خوش شکل عورتوں کے چہرے بے رونق ہو جایا کرتے ہیں۔

نزہت کو ان کا یہ عالم بھی تو پسند نہ تھا۔ اس نے، انکو ایک بار پھر ڈانٹا۔

یہ تم میری اس ذرا سی دھمکی سے بیہودوں کی تربیت کیوں بھول گئی ہو۔ یہ تمہارے چہروں پر غم کی بدلیاں کیسے چھا گئی ہیں۔ یہ تم مسکرا کیوں نہیں رہیں۔

وہ سب مسکرا پڑیں اس مسکراہٹ میں کتنا جبر تھا کیسی تلخی تھی۔ کیسا اضطراب تھا۔ یہ اضطراب تو قریب قریب ویسا ہی تھا جیسا کہ رات کو زمرد کے چہرے سے پر چھلک رہا تھا۔ یہ تو ویسا ہی دھندلاپن تھا جس نے زمرد کی لانبی لانبی زرد آنکھوں کی زردی غیر معمولی حد تک بڑھا رکھی تھی۔ نزہت کا تخیل دفعتاً، اس زمرد کی طرف اُچکا!! اور وہ نجم کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے سوچنے لگی۔

کیا ہنسی۔ کیا قہقہے، ہمارے چہرہ پر اپنے ہاتھ سے ملے ہوئے پوڈر کی حیثیت تو نہیں رکھتے۔ کیا انکی قیمت اس سے زیادہ کچھ نہیں!

یہ سوچ کر اس کے اپنے چہرے پر وہی دھند چھا گئی جو ان سب کے چہروں پر چھائی تھی۔ یہ تو نجم ظالم فوراً سنبھل گئی۔ اور بے اختیار مسکرا پڑی۔ جبر کے دھندلے پن میں ڈوبی ہوئی ان لڑکیوں کے چہرے بھی مسکرانے لگے۔

مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

دوسرا باب

ٹیلیفون کی گھنٹی یوں بج رہی تھی جیسے کہیں آگ لگ گئی ہے اور فائر انجن یہ آگ بجھانے کے لئے گھنٹیاں بجاتا شور مچاتا بڑھا چلا جا رہا ہے۔

نزہت نے جھنجھلا کر، کتاب ہاتھ سے پھینک دی۔ اور ریسیور کانوں سے لگاتے ہوئے ڈانٹا۔ آخر یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کیا کہیں آگ لگ گئی ہے جو اس درجہ ڈھٹائی سے کام لیا گیا ہے۔

ادھر سے سورن کی آواز آئی۔

جی نزو! آگ ہی لگی ہے۔ اگر آگ نہ لگی ہوتی تو تجھ گنگا ماتا سے مدد کیوں مانگتی

نزہت نے آواز پہچان کر طنز کی۔

سورن دیوی جی یہ تو مجھ ابھاگن کو بھی کا معلوم ہے کہ سرکار میجر متو پر ہزار جان سے فدا ہیں۔ آج یہ اچانک اس قدر بے صبری کیوں دکھائی جا رہی ہے۔ آخر میجر متو لام پر نہیں چلے گئے۔

سورن نے دکھڑا رو دیا۔

لام پر چلے جاتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ کم سے کم میں خود کو فریب تو دے لیتی مگر اب تو نزو انہوں نے بھری محفل میں میرے منہ پر تھوک دیا ہے۔

نزہت نے مذاق اڑایا۔

ارے کیا سچ مچ اس گدھے نے تجھ دیوی کے منہ پر تھوکا ہے۔ مجھے بتا وہ اس وقت کہاں ہے۔ میں ابھی تیرے ساتھ وہاں چل کر اسے ایسی سزا دوں کہ ساری

چوکڑی بھول جائے۔

سورن نے روتی آواز میں کہا۔

تم تو نزہو! ہر بات کو مذاق میں لے اُڑتی ہو۔ یہاں جان پر بنی ہے اور تمہیں نخرے سوجھے ہیں۔

نزہت کو کسی قدر دلچسپی ہوئی۔

بھئی عشق کیا ہے، تو جان پر بنے ہی گی۔ یہ کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ آخر عشق ہے۔

اور پریم راگی کہہ گئے ہیں۔

عشق کرے نہ کوئے،

بُجھ سے کس حکیم نے کہا تھا عشق کر

دفعتاً پیچھے سے کسی نے لقمہ دیا۔

یہ حکیموں کا زمانہ نہیں بھئی ڈاکٹروں کا دور ہے۔

نزہت نے مُڑ کر دیکھا۔ ڈاکٹر مشتاق احمد اپنی پوری فوجی وردی پہنے، اپنے لانبے لانبے ہاتھوں کو پتلون کی جیبوں میں ڈالے اس کے قریب آن کھڑا ہوا تھا۔ نزہت اسے دیکھ کر حسب عادت مسکرائی اور ٹیلیفون کے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر آداب بجا لا کر کہا۔

تشریف رکھیے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد پہلے ہی کی طرح کھڑا رہا۔ اور اپنی لال لال آنکھوں میں اپنے سارے مردانہ جوہر بھر کر اس نزہت کے سراپا کو تکنے لگا اور اس نے گھبرا کر

سورن سے کہا۔
بھئی سورن! یہ ڈاکٹر مشتاق احمد میرے سر پر آن کھڑے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں۔ تمہیں عشق ہوا ہے تو حکیموں کے پاس مت جاؤ۔ ہم ڈاکٹروں کے پاس آؤ۔ آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں۔

سورن کی آواز میں ایک عجیب سرخوشی بھر گئی۔
ارے کیا ڈاکٹر مشتاق تمہارے گھر آئے ہیں۔ انہیں وہیں روک لو۔ میں ابھی اڑتی ہوئی تمہارے گھر آئی۔

یہ کہہ کر ٹیلیفون کاٹ دیا۔ نزہت نے ریسیور رکھ کر ڈاکٹر سے پوچھا!
ارے ڈاکٹر صاحب! وہ تو بگلی سچ مچ حکیموں کی بجائے ڈاکٹروں پر عقیدہ رکھتی ہے۔ اور تمہارے پاس بھاگی آ رہی ہے۔

ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ جیبوں سے نکال لئے۔ سگرٹ کیس نکالا۔ اور سگرٹ سلگا کر پے در پے کئی کش لگائے۔ اس نے نزہت کی اس عجیب بات کے متعلق کوئی رائے بھی تو ظاہر نہ کی، نزہت نے اس مشتاق کو دیکھا اور سوچنے لگی۔

حضرت اب ذرا اونچے اُڑنے لگے ہیں۔ میجر کیا ہو گئے ہیں سمجھتے ہیں۔ ہم اب ان کی خوشامد کریں گی۔

مگر یہ میجر مشتاق بے چارا اونچا نہیں اُڑ رہا تھا۔ وہ تو اس کے قدموں میں جگہ پانے کے خواب کبھی سے دیکھ رہا تھا۔ یہ تو وہ خود ہی اونچی اُڑ رہی تھی اور اپنے بوٹے بوٹے نازک نازک سے قدموں کو ہر اس لمحہ سکیڑ لیتی۔ جب یہ غریب بے زبان قسم کا ڈاکٹر اس کے حضور حاضری دیتا۔

اس غریب میجر کی کیا مجال تھی کہ اس کے حضور اونچی اڑان کی سوچتا۔ وہ آج بے چارا مدتوں کے انتظار کے بعد اس کے حضور اس لئے حاضر ہوا تھا کہ میجر منّو میاں کے فرار کی داستان سنانے کے بہانے اپنے دل کی بے چینیاں عرض کرے گا میجر منّو سے وہ ہمیشہ مرعوب رہتا۔ اس کا خیال تھا۔ نزہت اور میجر منّو میں کچھ ایسا قرب ہے کہ اس کے ہوتے اس کی دال گل نہیں سکتی اور اب جبکہ میجر منّو زمرد بیگم کے ساتھ، لفٹ رائٹ کرتا کہیں گم ہو گیا تھا۔ وہ بڑی آرزوؤں کیساتھ یہاں پہنچا تھا۔

اس وقت اس پر جو بدحواسی سی چھائی تھی۔ اس کے دل پر جو رعشہ سا تھا اس کو کم کرنے کے لئے اس نے سگرٹ کے دھوئیں میں پناہ لی تھی۔

نزہت نے اسے بے تحاشہ سگرٹ کے کش لگاتے دیکھ کر نجم کو پکارا اور جب وہ چھم چھم کرتی مسکراہٹوں کے تانے بانے فضا میں بنتی اسکے حضور حاضر ہوئی تو نزہت نے میجر مشتاق احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نجم کو حکم دیا۔

نجم ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔ دھوئیں اُڑا رہے ہیں۔ ذرا ساری کھڑکیاں تو کھول دو۔

ڈاکٹر بے چارے نے شرما کر، دو قدم پیچھے کی طرف ہٹ کر سگرٹ راکھ دان میں پھینک دی اور معذرت کی۔

معافی چاہتا ہوں نزہت بیگم، آج میں پھر بھول گیا۔

نزہت نے [illegible]

یہ تو ڈاکٹر صاحب آپ ہمیشہ بھول جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق نے خوشامد کی۔

اب کہ معاف کر دیجئے آئندہ نہیں بھولوں گا۔

نجم نے سفارش کی۔

چلیئے سرکار معاف کر دیجئے۔ بے چارے ڈاکٹر صاحب تو نئے نئے ممبر بنے ہیں کیا سوچیں گے۔ آپ ان کی اتنی سی خطا بھی معاف نہیں کر سکتیں۔

پھر آپ ہی آپ ایک قہقہہ مار کر چھم چھم کرتی باہر کو بھاگ گئی۔ اور ڈاکٹر مشتاق سوچنے لگے۔ ایک ان لوگوں کی دنیا ہے جہاں قہقہے ہی قہقہے ہیں جہاں مسکراہٹوں کی روشنیں ہر سو پھیلی ہیں۔ جہاں ہنسی کے پھول قدم قدم پہ کھلے ہیں۔ ایک میری دنیا ہے جہاں نہ قہقہے ہیں۔ نہ مسکراہٹیں۔ کیا یہ مسکراہٹیں میری جھولی میں کبھی نہ بھری جا سکیں گی؟

وہ یہ سوچ رہا تھا اور نزہت چاہ رہی تھی سورن جلدی سے آجائے۔ اور اس کا پنڈ۔ اس احمق ڈاکٹر سے چھڑائے۔ نزہت کو یہ احمق ڈاکٹر کچھ زیادہ نہ بھاتا تھا۔ اس کی سنجیدہ سنجیدہ سی صورت، اس کا فلسفیوں ایسا انداز گفتگو۔ اس کے نزدیک محض مضحکہ تھا۔ محض سامانِ تفریح۔ وہ محفل میں اس کی سنجیدگی اور فلسفیانہ گفتگو پہ ہنسنے کو ہر لمحہ آمادہ رہتی مگر اسے خلوت میں در آنے کی راہ داری دینے پر کبھی تیار نہ ہوئی تھی۔

وہ نہ اس کا ہم پلہ تھا نہ ہم مذاق۔ یہ تو ممبر منّو اسے پچھلے سال اچانک اپنی ٹولی میں پکڑ لایا۔ اور نزہت نے اسے منّو کی خاطر برداشت کر لیا ورنہ اس سنجیدگی کے قطب مینار کی سمائی یہاں نہ تھی۔ وہ خواہ زیادہ سمجھدار نہ تھا۔ مگر اپنی حیثیت خوب جانتا تھا اس لئے ہمیشہ ممبر منّو کی رکاب میں یہاں پہنچا۔ اور آج بھی اس کی داستان کے سہارے یہاں تک رسائی پائی تھی۔ نزہت نے جو اسے اس طرح خوش آمدید

کہا وہ بھی میجر منّو کی خاطرداری تھی۔

نجم چلی گئی تو نزہت نے دو قدم آگے بڑھ کر ڈاکٹر سے پوچھا۔

کیوں ڈاکٹر صاحب، کچھ پیجئے گا۔

ڈاکٹر کا جی چاہا دونوں ہاتھ جوڑ کر عرض کرے۔

آپ اگر ساقی بنیں اور مجھے زہر بھی پلائیں تو خدا جانتا ہے ضرور پی لوں۔

مگر یہ بات جرأت چاہتی تھی۔ اور ڈاکٹر مشتاق کے پاس اسی شئے عجیب کی کمی تھی۔ وہ یوں تو فوج میں میجر تھا۔ مگر دل بڑا کمزور پایا تھا غریب کے اس دل پر تو اس وقت ایک عجیب لرزا آن چڑھا تھا جبکہ حسن و رعنائی کی یہ شمشیر براں اس کے اس قدر قریب آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی قاتل لانبی لانبی آنکھیں اس کے سنہرے گھنگھریالے بال، اس کی صراحی دار گردن۔ اور لانبا حسین قد۔ اسے ہزار دل شعلوں سے لپٹا محسوس ہو رہا تھا۔ ہزاروں قیامتیں ٹوٹتی نظر آرہی تھیں۔

اس نے بے چارگی اور بے بسی کے اس عجیب عالم میں اور تو کچھ نہیں کیا دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

نزہت بے اختیار ہنس پڑی اور اپنی سنہری زلفوں سے کھیلتے ہوئے ڈاکٹر کو اس طرح دیکھنے لگی جیسے ڈاکٹر ابھی ابھی چڑیا گھر سے بھاگ کر آیا تھا۔

ڈاکٹر نے اسے اپنے آپ کا یوں مطالعہ کرتے پایا تو جھینپ گیا۔ اور آنکھیں جھکا کر سوچنے لگا۔

کیا کبھی وہ گھڑی نہ آئے گی جب میں ان مدھ بھری کالی کالی لانبی آنکھوں میں جھانک سکوں گا۔

اور اس لانبی لانبی سیاہ آنکھوں والی نزہت نے ڈاکٹر کو آنکھیں جھکائے ہوئے دیکھ کر نجم کو ایک بار پھر آواز دی۔

اس بار جب نجم آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹیلگرام تھا۔

نزہت نے یہ ٹیلگرام تو اس سے اچک لیا اور حکم دیا۔

ڈاکٹر صاحب کے پینے کے لیے کچھ لاؤ۔

نجم نے سرکار کا اشارہ پایا تو ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

کیوں ڈاکٹر صاحب کیا لاؤں۔

ڈاکٹر صاحب فرمائش کے عالم میں نہ تھے۔ مسکرا کر چپ ہو گئے نجم ابھی کوئی دوسری بات کہہ نہ پائی تھی۔ کہ نزہت نے ٹیلگرام کے فارم سے نظریں ہٹاتے ہوئے بہت تیزی کے ساتھ ڈاکٹر سے پوچھا۔

کیوں ڈاکٹر صاحب آپ نے آتے ہی مجھے کیوں نہیں کہا میجر منو یہاں سے بھاگ کر آگرہ کے تاج محل میں جا چھپے ہیں اور شاہجہاں اور ممتاز محل کے مزار پر اس زمرد بیگم کے ساتھ فاتحہ خوانی کر رہے ہیں جسے حضرت رات ہمارے ہاں لائے تھے۔

اس نے غصہ میں تار کے فارم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور پھر یہ ٹکڑے اپنے نازک پاؤں سے مسلتی ہوئی بالکل ایک نرالے انداز میں گرجی۔

وہ فریبی زمرد رات بھر میرے پاس بیٹھ کر ٹسوے بہاتی اور آہیں بھرتی رہی

آخر کے لفظ اس نے ڈاکٹر کے بہت قریب آن کر کہے

تم بھی اس سازش میں شریک ہو۔ تمہاری مدد کے بغیر اس چھچھورے کو اتنے بڑے ذلیل فعل کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ تم کون سا منہ لے کر میرے ہاں

پہنچے ہو۔ تمہیں یہاں آتے ہوئے ذرا شرم نہ آئی۔

ڈاکٹر نے اس فتنۂ دو عالم کا یہ رُخ کبھی دیکھا نہ تھا۔ اس نے تو ہمیشہ اس کے قہقہے سُنے تھے۔ ہمیشہ اسے ہنستے پایا تھا۔ وہ تو بے چارہ دو دن کا شناسا تھا۔ یہ بیگم بھی جو برسوں سے اس گھر میں رہ رہی تھی۔ نزہت سرکار کے اس رُخ سے واقف نہ ہوئی تھی۔ اس نے بھی کبھی اسے یوں طوفانوں کی طرح گرجتے اور آندھیوں کی طرح شور مچاتے نہ پایا تھا۔ ڈاکٹر کی طرح وہ بے چاری بھی بری طرح سہم گئی۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ چھپاں رہنے والی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔

مگر یہ تو ابھی طوفان کی تمہید تھی۔ یہ تو ابھی قیامت نے سر اُٹھایا تھا۔ نزہت کے غصہ نے تو اس وقت عجیب خوفناک صورت اختیار کر لی جب سورن نے اُلجھے اُلجھے بالوں کے ساتھ اندر قدم رکھا!

نزہت اسے دیکھتے ہی بھوکی بلی کی طرح اس پر لپکی اور اسکے پریشان بالوں کی کئی لٹیں اپنی مٹھیوں میں بھینچتے ہوئے بیخی!

بزدل کہیں کی۔ تو نے اس کمینے کو ہم لوگوں کے علم کے بغیر اس طرح کیوں بھاگ دیا۔ ہمارے گروہ کی بے عزتی کیوں ہونے دی!

سورن بید مجنوں کی طرح کانپنے لگی تھی۔ وہ آئی کس لئے تھی اور یہاں کیا ہونے لگا تھا۔ بیوقوف اس نزہت پر بے حد بھروسہ رکھتی تھی۔ اسے اعتماد تھا۔ نزہت کی مدد سے وہ بھاگے ہوئے محبوب کو پھر پکڑ لائے گی۔

مگر یہاں تو کچھ اور ہی عالم تھا۔ ایسا عالم جس سے وہ اس سے پہلے کبھی آگاہ نہ تھی۔

پھر نہ جانے اس نزہت کو کیا ہوا، وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے سورن کی زلفیں اپنی مٹھیوں سے نکال دیں اور اس کے گلے میں اس طرح باہیں ڈال دیں جیسے اسے اپنے سینہ سے لگا کر اپنے دل کا غم ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

سورن کی آنکھیں آپ بہ نکلی تھیں۔ جسم ابھی تک کانپ رہی تھی اور ڈاکٹر مشتاق احمد کو تو سکتے کی بیماری لاحق ہو گئی تھی۔ وہ کیسی کیسی آرزوئیں لے کر یہاں آیا تھا۔ اور یہاں تو کسی آرزو کے پنپنے کی گنجائش نہ تھی۔ یہاں تو ساقی نے آپ ہی ہر پیمانے کو توڑ پھوڑ دیا تھا۔ آپ اپنے ہاتھوں سے شراب لنڈھا دی تھی۔

ہر پیمانے کو توڑنے والے اس ساقی کے متعلق ڈاکٹر نے جو رائے قائم کی تھی وہی سورن کی تھی۔ سورن بھی یہی سمجھی تھی جو ڈاکٹر سمجھا تھا۔ اس لمحہ سورن کا جی چاہ رہا تھا۔ اسی نزہت کے سامنے اپنا گلا گھونٹ لے اور مرنے سے پہلے کہے۔

میں تو خیر احمق تھی۔ میرے اندر تو کوئی خوبی نہ تھی۔ کوئی رعنائی نہ تھی اور تو تو ہر فن مولا تھی۔ تجھے یہ منو اتنا عزیز تھا تو تو نے اسے اپنے لیے کیوں مخصوص نہ کر لیا۔ اسے ایک آوارہ چھوکری کے ساتھ کیوں بھاگنے دیا۔

مگر یہ سورن ایک سکھ بریگیڈیئر کی بیٹی ہونے کے باوجود محض خشخش تھی۔ وہ جس طرح ہمیشہ مجبر منو سے ڈرتی رہی۔ اس نزہت سے بھی مرعوب رہی۔ اسے اسکی باہیں اپنے گلے سے نکال کر اس اتنے بڑے اقدام کی جرات تک نہ ہوئی۔

مگر اس نزہت کو ہر جرات تھی۔ ابھی اس نے تھوڑی دیر پہلے اسکے بال نوچے تھے اب اسے گلے سے لگائے تھی تھوڑی دیر بعد اسے پھر بہت زور سے پرے دھکیل دیا اور خود دیوانوں کی طرح بھاگتی ٹیلیفون پر آئی۔ ریسور اٹھایا اور جھمی کا نمبر ملا کر چیخی۔

چھمی! یہ رذیل سورن میرے پاس روتی ہوئی آئی ہے۔ میجر منّو اسے چھوڑ کر زمرد کے ساتھ بھاگ گیا ہے۔ اور تو حرافہ کہاں مر گئی تھی۔ تو یوں تو اس کے عشق میں ہر وقت غرق رہتی اور اب اسے اس طرح بھاگ جانے دیا ہے۔ تجھ میں اسے روکنے کی ہمت نہ تھی۔ تو تو نے مجھ سے کیوں نہ کہا۔

مجھ سے کیوں نہ مدد لی۔

چھمی۔ سورن کی طرح بزدل نہ تھی۔ ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"جی ہاں! تو تو رستم و سہراب سے پنجے لڑاتی رہی ہے۔ تو تو امیر حمزہ کی بیٹی ہے نا!

اری میں جانتی ہوں! تو خود اس منّو پر ہماری ہی طرح فریفتہ تھی۔ اور تجھ میں بھی اتنی ہمت نہ تھی۔ کہ تو اسے جیت سکتی۔

ابھی بات ختم نہ ہو پائی تھی کہ نزہت نے جھنجھلا کر ریسور ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور نجم کو حکم دیا۔ تینوں موٹریں نکال لے۔ اور بریگیڈیئر آفتاب احمد۔ کرنل رحیم میجر شہاب، کپتان سلیم۔ نواب زادہ افتخار صاحبزادہ بلند بخت۔ چھمی۔ نواب زادی سلمیٰ رحمان۔ انیس خاتون۔ اکبری بیگم، رفیعہ سلطان۔ مکرم جاہ۔ رفیع احمد، دلیش بندھو، کرم چند اور باقی سب کو پکڑ کر یہاں لے آئے۔

نجم کانپتی ہوئی چلی گئی۔ تو اس نے سورن پر توجہ کی، سورن منہ سجائے ہوئے ایک صوفہ کرسی کے بازو پر دیوار کی طرف منہ کئے بیٹھی تھی۔ نزہت اپنی ساڑھی کے دامن کو غصے میں مٹھی میں بھینچتی ہوئی اس کے قریب آئی اور اس کے دیوار کی طرف کئے ہوئے چہرے کو زبردستی اپنی طرف پھیر [illegible] ٹ پڑی۔

تو تو جانتی تھی مجھ میں میجر منو کو پھانسنے کی ہمت نہیں ہے۔ پھر تو خود کیوں پیچھے رہی۔ تو خود کیوں آگے نہیں آئی۔

اور اب.....

اس سے آگے اس کی آواز بھرا گئی اور نزہت نے غصے میں بے قابو ہو کر ایک بار اور اسکے بال اپنی مٹھیوں میں پکڑ لیے اور شیرنی کی طرح گرجی۔

"تو نے مجھ سے اپنی کمزوری کا اعتراف کب کیا تھا۔ تو تو ہر وقت اس کا دم چھلا بنی پھرتی تھی۔ اسکے اعزاز میں دعوتیں کرتی اسکے سوٹ سلاتی اسکے بل ادا کرتی۔

تو نے ایک دن بھی تو مجھ سے مدد نہ مانگی اور اب آئی ہے۔

دیکھ اب میں کیا کرتی ہوں۔ دیکھ اب میں اس ذلیل چھوکرے سے کیسا انتقام لیتی ہوں۔"

اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی اور اسے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ٹیلیفون کی طرف بھاگنا پڑا۔ سورن کے اندر بال نچوانے سے شائد عورت پن جاگ گیا تھا۔ کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھی۔ الجھے ہوئے نچے ہوئے بال درست کئے اور ڈاکٹر شتاق کے زرد زرد چہرے پر نظریں ڈالتی ہوئی باہر کو لپکی۔ نزہت نے اسے ڈانٹا۔

خبردار جو ایک قدم آگے بڑھایا۔ سر وجاہت عالم کی قسم باداکے جرمن میڈ ریوالور کی ساری گولیاں تیری چھاتی کے پار کر دوں گی۔

بزدل سورن اس دھمکی سے سچ مچ ڈر گئی اور جہاں سے اٹھی تھی کانپتی ہوئی وہیں آن بیٹھی۔ ادھر سے چھمی نے اسے اس طرح چنگارتے پاکر پہلے پر دہلا مارا۔

یہ تم بزدل سورن کو اپنے باداکے ریوالور سے ڈرا رہی ہو اتنی جی دار ہو تو

باواکا یہ ریوالور لے کر آؤ نہ میرے پاس ۔میں تمہیں بتاؤں تمہارے ہاتھوں میں ریوالور پکڑنے کی کتنی قوت ہے ۔

نزہت نے کوئی جواب نہیں دیا اور غصہ میں رسیور ہاتھ سے پھینک کر ڈاکٹر مشتاق کے پاس آن کھڑی ہوئی ۔اور اپنی لال سرخ آنکھیں اسکے سراپا پر ڈالتے ہوئے پہلے ہی سے انداز میں پوچھا ۔

کیوں ڈاکٹر !تم میں میرے باوا کے ریوالور کی کتنی گولیاں کھانے کی ہمت ہے ۔

ڈاکٹر میں گو ایک گولی کھانے کی بھی سکت نہ تھی ۔گو اس کے حواس مختل ہو چکے تھے ۔مگر محبوبہ کے اس استفسار نے اس میں اچانک فرہاد و مجنوں کی سی دیوانگی بھر دی ۔اور اس نے اپنے کوٹ اور قمیض دونوں کے بٹن نوچتے ہوئے اپنا سینہ کھول کر اسکے سامنے کر دیا اور زندگی میں پہلی بار انتہائی جرات سے کام لیکر جواب دیا ۔

آپ کے باوا کے ریوالور کی ساری گولیاں ختم ہو جائیں تو بھی یہ سینہ ہمت نہیں ہارے گا ۔

اور یہ مجوبہ عالم نزہت جو ابھی غصے سے لال سرخ ہو رہی تھی جس کی آنکھیں ابھی تک انتہائے اضطراب میں تند کمان کی طرح تنی تھیں ۔مست شرابیوں کی طرح قہقہے مارنے لگی ۔اور ڈاکٹر مشتاق اور سورن دونوں ایک عجیب حیرانی کیساتھ سوچنے لگے ۔

یہ نزہت کس دنیا کی مخلوق ہے ابھی شعلوں سے لپٹی تھی ۔ابھی پھولوں کی بارش کر رہی ہے ۔

یہ نزہت جو کچھ تھی اسے خود بھی آج سے پہلے معلوم نہ ہوا تھا کہ وہ کیا ذاتِ شریف ہے ۔اس پر اپنے یہ اوصاف آج تک آپ کھلے نہ تھے اسکی فطرت

کے پھیرے پر سے جو پردے آج اچانک اٹھ گئے تھے وہ اگر نہ اٹھے ہوتے تو وہ اپنے آپ کو آپ سمجھ نہ سکتی۔ وہ تو آج چار بجے تک سوچتی رہی تھی کہ کیا وہ بھی رو سکتی ہے۔ کیا وہ بھی آنسو بہا سکتی ہے۔ اس نے رونے کی کوشش بھی کی تھی مگر رو نہ سکی تھی۔ اور اب اس وقت روئی بھی تھی آنسو بھی بہائے تھے۔ دل میں عجیب عجیب طوفان بھی اٹھے تھے اور غصے اور اضطراب کے بادلوں نے بھی نہ جانے کہاں کہاں سے اس کے دل کے آسمان پر یورش کی تھی۔ اور ابھی چند ساعتیں پہلے تک اسے آپ ایسے لگ رہا تھا۔ جیسے غصہ کے مارے اور اندرونی اضطراب کے سبب اس کا سارا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہوا میں پھیل جائے گا یہ تو اس احمق ڈاکٹر مشتاق احمد نے۔ یہ عجیب مسخرے پن سے کام لے کر۔ اس کے اضطراب و ہیجان کی ہر شدت ختم کر دی۔ ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا۔

قہقہے لگاتی یہ نزہت تھوڑی دیر بعد جب سورن کے قریب آئی تو بالکل وہی نزہت تھی۔ جو کل رات تک ہمیشہ یکساں صورت میں اس سورن کے سامنے آئی تھی۔ اور جس کی خوش دلی، خوش مذاقی کے سبب ان کی محفل کی ساری رونقیں قائم تھیں۔

سورن کا جی چاہا اس قہقہے لگاتی نزہت سے اپنی آواز میں پوری سختی پیدا کر کے پوچھے۔

"یہ تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے جو خوفناک بھروپ بھرا تھا۔ اسکی تہ میں کیا تمہارے خون کی کوئی موروثی گندگی تو نہ چھپی تھی۔"

مگر سورن ابھی یہ بات اس نزہت سے پوچھ نہ پائی تھی کہ نزہت کے لانبے لانبے

انتہائی خوبصورت ہاتھ اس کی گردن میں پڑ گئے اور وہ اسے اپنے نازک سینہ سے قریب قریب کھینچے ہوئے ملحقہ کمرے میں لے گئی۔ یہ اس کے باپ کا اسلحہ خانہ تھا۔ سورن نے یہ اسلحہ خانہ اس سے پہلے بھی دیکھا تھا۔ اس سے پہلے وہ کبھی اس کمرے میں آتی ہوئی ڈری نہ تھی۔ مگر اس وقت تو اس پر اچانک ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی تھی اور وہ سوچنے لگی تھی یہ نزہت کہیں سچ مچ باپ کا ریوالور نکال کر کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے۔ اور ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی۔ نزہت نے اسے دفعتاً چھوڑ دیا۔ بڑے صندوق کے قریب آئی۔ اس کے بند ڈھکنے کو بہت زور کے ساتھ کھولا۔ اور ایک لمبا سا چھ گولیوں والا ریوالور نکال کر سورن کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں وہی وحشت پھر سے پیدا ہو گئی تھی جو تھوڑی دیر پہلے سورن نے ان میں بسی ہوئی پائی تھی۔ سورن احمق پہلے سے زیادہ زور کے ساتھ کانپنے لگی اور نزہت اس ریوالور کو اچھالتی، اس کا بنتی سورن کے پاس آن کھڑی ہوئی اور اسے پہلے جیسی بے باکی کے ساتھ اپنے چنگل میں لیے بڑے کمرے میں پہنچی۔ ڈاکٹر مشتاق پہلے ہی کی طرح کھویا کھویا بیٹھا تھا۔ اس کی چھاتی ابھی تک ننگی تھی نزہت سورن کو گھسیٹتی اس کے پاس لائی اور ایک عجیب قسم کے تمسخر بھرے لہجہ میں اس سے پوچھا۔

"کیوں ڈاکٹر! اب بھی تمہاری وہی رائے ہے جو تم نے تھوڑی دیر پہلے ظاہر کی تھی۔ کیا اب بھی اس ریوالور کی ساری گولیاں کھانے کی ہمت دکھا سکتے ہو۔"

ڈاکٹر مشتاق نے بھری بھری نگاہوں سے اس حسین جلاد کو دیکھا اور نہ جانے کیسے اسے یہ جلاد، دنیا جہان کی ساری عورتوں سے ہزاروں گنا خوبصورت رعنا اور عجیب معلوم ہوئی کہ اس نے اپنی چھاتی کچھ کہے بغیر اس کے سامنے کر دی۔ اور سورن

کی حیرت کی اس وقت کوئی انتہا نہ تھی جب نزہت نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کو پوری تندہی کے ساتھ فضا میں اچھالا، اور ایک جلاد کی طرح ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔

ڈاکٹر تو پھر بسم اللہ۔

دوسرے لمحہ اس کا ہاتھ لبلبی پر تھا۔ لیکن ابھی وہ لبلبی دبا نہ پائی تھی کہ پیچھے سے کسی نے بہت زور کا قہقہہ مارا۔ یہ چھمی تھی۔ اس کے قہقہے میں نہ جانے کیا کیا سنسنیاں چھپی تھیں کہ نزہت کا ہاتھ کانپ گیا۔ ایک زور کا دھماکا ہوا۔ دھواں بھی اٹھا مگر گولی سامنے کے گلدان میں جا لگی۔ ڈاکٹر مشتاق کا سینہ بچ گیا تھا۔ اور یہ چھمی۔ اس طرح کود کر ڈاکٹر اور نزہت کے درمیان آن کھڑی ہوئی تھی جیسے وہ دہلی پولیس کی نمائندگی کرنے آئی تھی۔ نزہت نے انتہائی غصے کے ساتھ ڈاکٹر کی بجائے اب اسکی سنشت باندھی۔ چھمی نے ایک بار اور پہلے جیسا خوفناک قہقہہ مارا۔ نزہت کا ہاتھ پھر کانپ گیا۔ اس دفعہ گولی ایک اور گلدان کو زخمی کر کے ٹھنڈی ہو گئی۔ تیسری بار وہ لبلبی پھر دبانے کو تھی کہ اچانک دو مضبوط ہاتھ اس کی پشت پر آن رکے اور پیچھے سے ایک بہت زور دار آواز گونجی۔

ارے یہ کیا تماشہ کر رہی ہو تم۔ یہ کیا انوکھا کھیل کھیلا جا رہا ہے یہاں۔ کیا ہم سب لوگوں کو یہاں اسی لیے طلب کیا گیا تھا۔

کیا یہ خاص دعوت نامہ اسی تقریب کا تماشہ کرنے کیلئے آں جناب نے ارسال فرمایا تھا۔

یہ نواب زادہ برگیڈیئر آفتاب احمد خاں تھے۔ نزہت نے مڑ کر انہیں دیکھا ریوالور ہاتھ سے پھینک دیا اور ان کے مضبوط سینہ میں اپنا نازک سر چھپا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے رونے کا یہ تماشہ نہ چھمی نے پہلے کبھی کیا تھا اور نہ

نواب زادہ آفتاب احمد خاں ہی کو یہ سعادت ملی تھی۔ اور نہ ان لوگوں میں سے کسی نے یہ دلچسپ سین کبھی ملاحظہ کیا تھا جو ابھی ابھی اس کمرے میں پہنچے تھے۔ وہ سب حیرت بہ دم تھے۔ کہ یہ نزہت نواب زادہ آفتاب احمد خاں کے سینہ پر سر رکھے اس طرح کیوں رو رہی ہے۔ چھمی کو دعویٰ تھا وہ اس سبب سے واقف ہے سورن بھی کچھ کچھ سنبھل گئی تھی۔ اور نواب زادی سلمیٰ رحمان اور اکبری سلطان کے کانوں کے قریب منہ کئے سرگوشی کر رہی تھی۔

یہ سب کھیل منّو کے فراق میں کھیلا جا رہا ہے۔ وہ زمرد کو اچانک لے اڑا ہے اور صاحبزادی صاحبہ کے عشق کا بھانڈا یوں چوراہے میں پھوٹ گیا ہے۔

نواب زادی سلمیٰ رحمان جو منّو اور سورن کے باہمی تعلق سے آگاہ تھی سوچ رہی تھی۔ یہ سورن حراقہ اپنی بات کیوں چھپا رہی ہے۔ حالانکہ اس کے چہرے پر زردی کی جو تہیں جمی ہیں وہ کچھ اور ہی بات کہہ رہی ہیں۔

چھمی نے ان سب کے سامنے ایک اور زور کا قہقہہ لگایا ڈاکٹر مشتاق نے اپنی ننگی چھاتی کوٹ کے دامن سے ڈھانک کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ یار لوگ اب ساری بات سمجھ گئے۔ اور بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں نے ان سب کی نیابت کرتے ہوئے اس کونے کا رخ کیا جہاں یہ ڈاکٹر مسکین صورت بنائے قریب قریب موت کے سے سکرات میں مبتلا تھا۔ وہ بریگیڈیئر تھے اور انسانی خون سے ہولی کھیلنے کی انہیں عادت تھی انہوں نے کچھ پوچھے بغیر اس مسکین صورت ڈاکٹر کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا اور اسے اس طرح اوپر اٹھا لیا۔ جیسے وہ محض ایک حقیر سا کھلونا تھا ابھی انہوں نے اسے زمین پر اچھی طرح پٹخا نہیں تھا کہ چھمی نے پوری قوت کے ساتھ ان کی پشت میں اپنے

دونوں نازک ہاتھ مارے۔

بریگیڈئیر صاحب نے مڑ کر دیکھا مشتاق کو جس آرام کے ساتھ اٹھایا تھا۔ اسی آرام کے ساتھ صوفے پر گرا کر اس چھمی پر توجہ کی۔ ان کی آنکھیں چڑھی تھیں۔ اور ان کے دونوں مضبوط ہاتھ فضا میں پھیلے تھے۔ چھمی ان سے ذرا نہیں ڈری اور ایک نڈر عورت کی طرح کہنے لگی۔

مجھے آپ کے ان بازوؤں کی طاقت خوب معلوم ہے۔ یہ بازو انگریز کی خاطر نہتی انسانی بستیوں کو موت کی نیند سلانے کی قوت یقیناً رکھتے ہیں۔ لیکن یہاں ہماری موجودگی میں آپ ڈاکٹر مشتاق کو محض اس حرافہ زنّو کی حمائت میں بے عزت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

بریگیڈئیر آفتاب احمد کی بھنویں تن گئیں۔ اور انہوں نے بڑے غصے کے ساتھ اسے دیکھا۔ یہ تو نواب زادی سلمیٰ رحمان اچانک سامنے آگئیں ورنہ بریگیڈئیر کے لانبے لانبے مضبوط ہاتھ چھمی کی نازک نازک گردن میں پیوست ہو گئے تھے۔ نواب زادی سلمیٰ رحمان نے آگے آن کر بریگیڈئیر صاحب کے یہ دونوں مضبوط ہاتھ اپنے نازک ہاتھوں میں لے لیے اور مسکراتی ہوئی کہنے لگی۔

"میں برسوں سے سوچ رہی تھی۔ ہماری یہ محفل جو ہر رات۔ قہقہوں کی فضا میں جمتی اور قہقہوں ہی کے شور میں منتشر ہوتی ہے کیا کبھی آنسوؤں سے شروع نہ ہوگی اور آہوں پر نہ ٹوٹے گی"

آج برسوں کی یہ سوچ، حقیقت بن کر سامنے آگئی ہے! اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم پہ مسرتوں اور خوشیوں کا چاند پھر کبھی طلوع نہ ہوگا! نہ جانے کونسی گھڑی تھی

جب وہ احمق میجر منّو اس کمینی اور ذلیل زمرد کو ہماری محفل میں لایا ....
اور یہ سارے ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے ۔

اس نے اپنے چاروں طرف پھیلے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اور بات جاری رکھی اس میں نہ ڈاکٹر مشتاق کا کوئی قصور ہے ۔ نہ نزہت بہن ہی مجرم ہیں۔ چھمی بھی یوں ہی اچھل کود رہی ہیں ۔

ساری بے ہودگی میجر منّو کی ہے ۔ اس نے، زمرد کے ساتھ اچانک کل رات بھاگ کرنا قابل برداشت حرکت کی ہے ۔

نزہت نے جو ابھی رو رہی تھی دفعتاً، نواب زادی کی بات کاٹ لی ۔

عزیز بہن ۔ یہ برداشت کا سوال نہیں ہے ۔ یہ ہمارے گروہ کی عزت وآبرو اور وقار کا سوال ہے ۔

منّو ہم سب کو عزیز تھا ۔ وہ ہماری اس محفل کا اس وقت سے رکن تھا ۔ جب ہم میں سے کئی ۔ ابھی شائد حروف ابجد سیکھ رہے تھے ۔

ہم سب نے اس پر ہمیشہ اعتماد کیا ۔ ہم سب نے اس کے ناز اٹھائے ۔ خاص طور پر سوسن اور چھمّی تو ہر وقت اس کا دم چھلا بنی رہتیں ۔

چھمّی نے احتجاج کی زبان کھولی ۔

خبردار جو تم نے میرے متعلق آگے ایک حرف بھی کہا ۔

منّو! اگر برا تھا ۔ تو تم اس کی برائی کے غم میں اپنے حواس کھو سکتی ہو ۔ تم دیوانگی میں اس سے انتقام لینے کی خاطر معصوم اور بے قصور لوگوں پر گولیاں چلا سکتی ہو ۔ لیکن میں اس کی توہین کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی اور ۔

ابھی وہ کچھ اور نہ کہہ پائی تھی کہ پارٹی کے ایک ایک رکن نے منّو کے خلاف آوازے کسے اور چھمّی، غصّے سے آنکھیں سرخ کرنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکی۔ اور چپ ہو گئی۔

نزہت نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

منّو نے جو حرکت کی ہے۔ وہ یوں تو ایسی ہے کہ میں اور میری طرح سب باقی ساتھی اپنے ریوالور کی ساری گولیاں اس کی چھاتی میں داغ کر دیں لیکن شاید ایسی بڑی بات ممکن نہ ہوا اس لیے میں نے آپ سب کو یہاں آنے کی دعوت محض اس لیے دی ہے کہ آپ سب مل کر طے کر لیں کہ منّو سے مکمل بائیکاٹ کیا جائے گا اور ہم میں سے کوئی اس کو کبھی قیامت تک منہ نہیں لگائے گا۔

چھمّی نے پھر احتجاج کیا۔

ہم آپ کی اس بے ہودہ رائے سے کبھی اتفاق نہیں کریں گی۔

نواب زادی سلمیٰ رحمان نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا اگر آپ اس رائے سے اتفاق نہ فرمائیں گی تو آپ کا بھی بائیکاٹ کرنے کی ہم میں ہمت ہے۔

ساتھیوں نے سوائے کپتان سلیم اور میجر شہاب کے نواب زادی سلمیٰ رحمان کی تائید کی۔ کپتان سلیم میجر منوّر کا بڑا قدیم ساتھی تھا۔ اور میجر شہاب چھمّی کے پروانوں میں سے تھے۔ اور جب بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں نے، ساتھیوں سے اس تجویز پر ووٹ لیے۔ تو کپتان سلیم، میجر شہاب اور چھمّی کے سوا نہیں باقی سب ہاتھ اٹھ گئے تھے ساتھی چیخ رہے تھے۔

منّو کا بائیکاٹ ہو گا۔

اور احمق سورن سوچ رہی تھی۔

یہ نزہت منو سے کس طرح کا عشق کرتی ہے کہ اس نے ساری محفل کو اسکے خلاف یوں بھڑکا دیا ہے خود وہ تو اب بھی میجر منو کے پاؤں کی دھوون بننے کو سارے جہاں کی سعادتوں سے بڑی سعادت سمجھ رہی تھی۔ اور جب تینوں مخالف اس کام روانی کے خلاف واک آؤٹ کر گئے تو سورن نے بھی بہت بجھے بجھے دل کے ساتھ ڈاکٹر مشتاق کے کان میں سرگوشی کی۔

ڈاکٹر صاحب چلئے ہم آپ بھی واک آؤٹ کر چلیں۔

میجر مشتاق واک آؤٹ تو یقیناً کر جاتا، اس کا سارا عشق، نزہو کی اس آج کی حرکت نے ختم کر دیا تھا۔ لیکن بزدل تھا ہمت نہ تھی، اور اُلجھے اُلجھے ذہن کے ساتھ سوچ رہا تھا یہ عورت تو نری جلاد ہے۔

خود بزدل سورن میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اکیلی واک آؤٹ کر سکتی۔

یہ محفل عجیب مسخروں اور ستم ظریفوں کی تھی ابھی تھوڑی دیر پہلے وہاں کس جوش اور کس عزم اور کس وقار کی اسکیمیں بن رہی تھیں۔ ابھی ساغر کھنکنے لگے تھے اور یہ مسخرے ایک دوسرے کی بغل میں ہاتھ ڈالے یوں ناچ اور گا رہے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا جیسے ان کے پرسکون اور مسرت بھرے سمندر میں کوئی کنکر گرا ہی نہ تھا۔

تیسرا باب

روضہ تاج محل کی سفید سفید سیڑھیوں پر بیٹھے اور اپنی فل توجہ وارفتگی میں لپٹے میجر منو کو زمرد بیگم کے خوبصورت بالوں میں کنگھی کرتے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ رات بھیگ

چکی تھی۔ ہلکے ہلکے بادلوں کی اوٹ میں سے تیرھویں رات کا چاند، کبھی کبھی جب منہ نکالتا۔ تو ایسا لگتا جیسے یہ روضہ تاج محل اس کی خوبصورت بارہ دریاں، اسکے سنگ مرمر کے مینار، گنبد، چھتیں، دیواریں اور باغ سب، محبت کا کوئی لافانی کوئی بہت ہی سریلا اور انوکھا، ہمیشہ زندہ رہنے والا گیت گانے لگے ہیں۔ قدرت بھی ان کے ہم نوا ہو گئی ہے۔ آسمان پر رہنے والے فرشتے بھی جاگ اٹھے ہیں۔ اور عرش کے مکین سب اس غیر فانی گیت کی لذت میں اس کائنات پر اتر آئے ہیں۔

زمرد کی زندگی کا تو یہ ایک عجیب تجربہ تھا۔ ایک ایسی سہانی روئداد تھی جس سے اس کی محروم و مجبور زندگی ہمیشہ تہی رہی تھی۔

اور اترسوں رات، اس رات سے صرف تین راتیں پہلے جب میجر منو کا ڈرائیور رحیم، اسے اپنے مالک کے پاس لایا تو وہ اپنی بے بسی اور بے چارگی پر روتی ہوئی آئی تھی۔

میجر منو شراب کے نشے میں تھا۔ اور وہ بدنصیب زمرد اس سے اس طرح ڈر رہی تھی جیسے بھیڑ اس وقت ڈرتی ہے جب اسے قصاب کی چھری کے سامنے لایا جاتا ہے۔ مگر یہ میجر منو قصائی نہ تھا۔ آدمی تھا۔ اس نے زمرد سے قصابوں ایسا سلوک نہیں کیا۔ لیکن پھر بھی وہ اس سے خوفزدہ رہی۔ دوسری رات جب میجر منو اسے اپنی سوسائٹی سے مانوس کرنے کی خاطر زبہت کے پاس لایا تو بھی وہ ڈری ڈری سی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ منو اس کی غربت، اس کی بے چارگی اور بے بسی کی نمائش کرنی چاہتا ہے۔ یہ نمائش نہ تھی تو اور کیا تھی وہ جس سائٹی

میں لائی گئی تھی وہ دہلی کی سب سے اونچی اور مہذب سوسائٹی تھی۔ اور اس کے جسم پر جو ساڑی تھی۔ وہ اتنی بوسیدہ اور بے رنگ تھی کہ اسے تنہائی میں پہنتے وقت اسے آپ شرم معلوم ہوتی چہ جائیکہ وہ اس مجمع میں لائی جاتی یہاں، کمخواب و بروکیڈ روزمرہ کے استعمال میں آتے تھے۔

اس رات تک۔ وہ غم و بے بسی کے ایک ایسے دھندلکے میں مبتلا تھی جس سے نکلنے کی اسے کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ یہ تو کل اچانک، ریجبر منّو نے، اسے اپنے سینہ سے بھینچ کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

زمرد اگر ہم تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنالیں تو کیسا ہو۔

اس کا دل اس طرح دھک دھک کرنے لگا جیسے وہ زندگی میں پہلی بار ہوائی جہاز میں بٹھادی گئی تھی۔

یہ اس کے لیے ہوائی جہاز میں بیٹھنے کی بات ہی تو تھی۔ فہیم کو اور اس کے ساتھ ساتھ کتنے دوسرے لوگوں کو معلوم تھا کہ ایک ہفتہ پہلے، نتھو نانبائی نے اپنے بیٹے کو محض اس لیے جان بوجھ کر تین مہینے کے لیے جیل بھجوا دیا تھا کہ وہ اس زمرد سے نکاح کرنا چاہتا تھا زمرد کی شہرت اس محلہ میں بڑی خراب تھی جہاں فہیم رہتا کوئی شریف عورت اسے اپنے گھر میں راہ دینے کے لیے تیار نہ تھی اس کا جرم محض یہ تھا کہ اس کو لگاتار ایک سال کے اندر تین مردوں نے شادی کا جھانسہ یا مگر [illegible] اس سے وفا نہ کی!

[illegible] مینہ بیس سال کی ہو گئی تھی۔ اس کی شکل کروڑوں میں ایک تو نہیں لیکن [illegible] ایک ضرور تھی۔ اس کی لانبی لانبی گہری گہری آنکھیں اپنے اندر

سمندروں ایسی گہرائیاں اور ان ایسی ہی وسعتیں رکھتی تھیں۔ اس کے بال لانبے لانبے سیاہ تھے۔ اور چہرہ گو زرد زرد سا تھا مگر نقش اتنے تیکھے تھے کہ جو دیکھتا تعجب سے دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا۔ مگر بدنصیب انتہا درجہ کی مفلس اور کسی حد تک غیرت مند تھی، افلاس اور غیرت کی یکجائی یوں تو اکثر ہوتی رہتی ہے مگر یہ یکجائی کبھی بھی سودمند نہیں ہوئی۔ مفلس غریب کی غیرت مندی ہمیشہ وجہ تضحیک بنی ہے۔ ہمیشہ دنیا والوں نے غیرت مند مفلس کو دیکھ کر اس پر طعنے کسے ہیں، دو دو وقت کھانے کو تو ملتا نہیں۔ مگر اکڑ اتنی ہے کہ دس گدھے بھی نہ اٹھا سکیں۔ بیچاری زمرد مفلس اور غیرت مند ہونے کے ساتھ ساتھ بے سہارا بھی تھی۔ اپاہج ماں کے سوا اس کا اس دنیا میں کوئی بھی تو نہ تھا۔

پچھلے سال کے شروع تک وہ دنیا میں تنہا نہ تھی۔ اس کا باپ زندہ تھا اور سرکاری نوکر تھا۔ فوج میں جمعدار تھا۔ گھر کا مرد خواہ پردیس میں ہو پھر بھی اس کا سایہ گھر والوں کے سروں پر موجود رہتا ہے۔ اور انہیں کوئی بے آسرا نہیں کہہ سکتا۔ زمرد کا باپ تو اچھے اور فرض شناس باپوں میں سے تھا۔ ہر مہینہ ساٹھ روپے باقاعدگی سے گھر بھیجتا رہتا۔

مگر اس لڑائی کا برا ہو۔ جو نہ جانے کیسے دس بیس سال کے بعد اپنے خوفناک جبڑے کھولے آپ ہی آپ دنیا کے عوام پر آن لپکتی ہے۔ اور ان کے لاکھوں افراد کو موت کے دامن میں سلا دیتی ہے۔ گو یہ لڑائی ابھی ابھی شروع ہوئی تھی۔ مگر زمرد کے باپ کو اپنے پہلے ہلے ہی میں موت کی نیند سلا گئی تھی۔ اور ان دونوں ماں بیٹی کو تو اس موت کی خبر پا کر ایسا لگا تھا جیسے ساری کائنات کے مرد موت کے غار میں

گر پڑے ہیں۔ جیسے ساری عورتیں اپنا سہاگ لٹا چکی ہیں۔ جیسے ہر بچی یتیم ہو گئی ہے باپ کی موت پر ہر بیٹی روتی ہے۔ مگر یہ زمرد تو اس طرح روتی جیسے اس کے ساتھ کوئی بالکل انوکھی اور ان دیکھی سنی بات بیت گئی تھی۔ اس کی ہر وقت آنسو بہانے والی آنکھیں اس وقت تو گنگا جیسی روانی سے بہنے لگی تھیں جب لیبیا کے محاذ سے اس کے بادا کا ایک ساتھی صوبیدار محمد خاں، اس کے باپ کی چند نشانیاں اسے دینے اس کے مکان پر آیا۔ صوبیدار محمد خاں نے یہ نشانیاں سے کیا دیں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے باپ کی تڑپتی مچلتی اور خاک و خون میں غلطاں نعش اس کے سامنے ڈال دی گئی ہے۔

صوبیدار محمد خاں انسان تھا۔ اور انسان ایسے ماتمی مناظر سے یقیناً اثر لیتے ہیں۔ محمد خاں نے بھی اثر لیا۔ اس کی اپنی آنکھیں آنسوؤں کی لڑیاں پرونے لگیں۔ اور یہ تاثر تو کچھ اس طرح بڑھا کہ صوبیدار محمد خاں۔ ہر دوسرے تیسرے دن، ان ماں بیٹی کی خبر گیری اور مزاج پرسی کے لیے سہارنپور سے چل کر وہاں آتا۔

گو جوان آدمی نہ تھا چالیس سال کا ہو چکا تھا۔ مگر ابھی تک شادی نہ کی تھی ... اور اس روتی زمرد کے آنسوؤں نے اس پر کچھ ایسا جادو کر دیا تھا کہ اسکا جی چاہتا۔ وہ اس زمرد کی ماں سے کہے۔

ماں اگر تم مجھے اپنا بیٹا بنانا پسند کرو تو میں زمرد سے کبھی بیوفائی نہ کروں گا۔

یہ بات کوئی بارھویں دن جب اس نے زمرد کی ماں سے جھجکتے جھجکتے کہی تو زمرد کی ماں کے نحیف جسم میں ایک عجیب حرارت پیدا ہو گئی۔ اور زمرد نے شرما کر،

اپنی اوڑھنی اپنے منہ پر گرالی محمد خاں شاعر نہ تھا۔ پھر بھی زمرد کی یہ ادا اسے اس درجہ بھائی، کہ اس کا جی چاہا۔ ہر پندرہ منٹ کے بعد وہ زمرد کی ماں سے اپنی یہ خواہش کہے اور زمرد اپنی اوڑھنی اسی طرح اپنے خوبصورت چہرہ پر گرالے۔

زمرد کی آنکھوں میں ہر لمحہ رہنے والے آنسو اس وقت سے اپنی راہ بھولنے لگے محمد خاں گو اب بھی دوسرے تیسرے دن آتا۔ مگر اس کے قیام کی مدت ہولے ہولے بڑھتی گئی۔ اور مہینہ سوا مہینے کے بعد، تو وہ پے در پے، دو دو تین تین دن، ان کے ہاں پڑا رہتا۔ پورے دو سال کے بعد جنگ سے آیا تھا۔ جیبیں بھری تھیں۔ ان بھری جیبوں کو بڑی فراخی کے ساتھ، ان دنوں پر خالی کرتا۔ زمرد کے لیے، نئے نئے تحفے، نئی نئی چیزیں روز خرید کر لاتا۔ اپنی پسند کے کپڑے، اپنا منہ پھیر کر، اپنی موجودگی میں اسے پہنواتا۔ جب وہ پہن چکتی اور وہ منہ پھیر کر اسے دیکھتا تو وہ بڑی طرح شرما جاتی اس وقت محمد خاں پوری بے تکلفی سے کام لے کر اس سے کہتا بنو جی! جب تم ہماری دلہن بنوگی، پھر ہم تمہیں اس طرح شرمانے نہ دیں گے اور۔۔۔۔۔

زمرد اس سے آگے اسے کچھ کہنے نہ دیتی جلدی سے آگے بڑھ کر اسکے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی وہ اس کے اس ہاتھ کو آنکھوں پر لگا لیتا۔

تین مہینے کی چھٹی، ختم ہونے میں صرف دس دن باقی رہ گئے تھے اور ابھی محمد خاں کے رشتہ دار، سہارنپور سے چل کر، زمرد کے ہاتھ پیلے کرنے کیلئے سنبری منڈ نہیں آئے تھے۔ محمد خاں جب بھی سہارنپور دو چار دن رہ کر زمرد کے ہاں آتا۔ زمرد کی ماں اس سے بڑے اشتیاق کے ساتھ پوچھتی۔

بٹیا، ابھی بار بھی تمہارے ساتھ، تمہاری، ماں، بہنیں اور دوسری رشتہ دا

عورتیں نہیں آئیں۔

محمد خاں کچھ جھجک سا جاتا اور ذرا رک کر کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتا۔

اس بار جب وہ سہارنپور سے لوٹا۔ اور رخصت ختم ہونے میں صرف سات دن باقی رہ گئے تھے تو ماں کی جگہ زمرد نے اس کے دونوں کھردرے ہاتھ اپنے نازک ہاتھوں میں لیکر، اپنی خوبصورت آنکھوں میں اپنی ساری جوانی بھر کر پوچھا۔

کیا چھٹی کی مدت بڑھائی نہیں جا سکتی!

محمد خاں نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

درخواست تو میں نے بھجوا دی ہے۔ دیکھو کیا جواب آتا ہے۔

زمرد نے اس کے کوٹ کے دامن سے کھیلتے ہوئے دوسرا سوال کیا

اگر چھٹی نہ بڑھی تو پھر اتنی تھوڑی مدت میں ہمارا بیاہ کیسے ہوگا۔ اور بیاہ کے فوراً بعد آپ مجھے اکیلے چھوڑ کر کیسے جانا چاہیں گے۔

محمد خاں نے اسے جواب میں اپنی گود میں بھر لیا۔ اور وہ شرما کر، اور اپنے آپ کو زبردستی چھڑا کر، دور بھاگ گئی۔

اس بار محمد خاں چار دن بیمار پڑا رہا۔ اور اس مدت میں اس نے زمرد سے بہت بے تکلفی برت لینے کی ہر کوشش کر لی، مگر یہ تو زمرد تھی جو جھجک رہی تھی یہ تو زمرد تھی جس کا دل اندر ہی اندر کسی بات سے ڈر رہا تھا۔ ورنہ یہ صوبیدار محمد خاں زمرد کی جوانی کو روگ لگانے سے کسی طرح باز نہ رہتا۔

چھٹی کے ختم ہونے سے تین دن پہلے محمد خاں، ملٹری ہیڈکوارٹر میں اپنی درخواست کا پتہ کرنے کے بہانے سے نئی دہلی گیا۔ مگر لوٹ کر نہیں آیا۔ زمرد روزانہ

صبح و شام اپنی چھت پر چڑھ کر گھنٹوں اس سڑک کو تکتی رہتی۔ جدھر سے محمد خاں آیا کرتا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں بھر بھر بہنے لگیں، اور وہ اپنی ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر شکوہ کرتی دکھائی دی۔

ماں اگر ان کو مجھ سے بیاہ نہ کرنا تھا تو پھر آس کیوں بندھائی جھوٹے وعدے کیوں کئے۔

ماں اس کے جواب میں آنسو بہانے اور آہیں بھرنے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ جب محلے کی لڑکیاں اس سے کہتیں۔

اری زمرد وہ تمہارے ہونے والے دولھا میاں تم سے شادی کئے بغیر لام پر چلے گئے۔

اری اور نہیں تو! تو نے اپنے ہاتھ ہی ان سے پیلے کرا لیے ہوتے۔

تو زمرد بے اختیار رو پڑتی، اس کے بس میں اگر یہ بات ہوتی تو وہ ایسا ضرور کرا لیتی مگر اس کے بس میں تو کچھ نہ تھا اس کے بس میں صرف ایک ہی بات تھی۔ کہ آنسو بہائے یا اگر کوئی اور شریف مرد اس کے ہاتھوں کو پیلا کرنے کی حامی بھرے تو وہ ضد سے کام نہ لے۔ محمد خاں سے اسے انس یقیناً پیدا ہو گیا تھا مگر اس تعلق کو عشق سے تعبیر نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے یہ بہت ممکن تھا کہ اگر کوئی دوسرا جوان سامنے آتا تو زمرد کے آنسو تھم جاتے ایسا ہی ہوا۔ اسی محلے کے ایک کھاتے پیتے چودھری فقیر محمد نے جو پھلوں کا تاجر تھا۔ زمرد کو کہیں زنانہ سے باہر نکلتے دیکھ لیا اور زمرد کی جوانی اس کا حسن سے اس قدر بھایا کہ اس نے اسی شام منڈی سے واپسی پر ایک بھانجی کے ہاتھ زمرد کے ہاں، ایک درجن سیب، چند ناشپاتیاں۔

کچھ کیلے اور امرود بھیج دیئے۔ یہ تحفہ پہلی بار زمرد کے ہاں پہنچا تھا۔ اس لیے اسکی ماں اور زمرد نے حیرت سے محمودہ سے پوچھا۔

اری محمودہ یہ آج تمہارے گھر والوں کو ہم غریب کیسے یاد آگئے۔

محمودہ پڑھا کر بھیجی گئی تھی۔ اس نے جھٹ جواب دیا۔

خالہ جی! آج ماموں جان کو اللہ کی مہربانی سے بڑی چھاؤنی کا ٹھیکہ مل گیا ہے۔ کئی ہزار روپے مہینے کا فائدہ ہوگا۔ اس خوشی میں ماموں جان نے یہ پھل بانٹے ہیں سب سے پہلے انہوں نے مجھے آپ کے ہاں بھیجا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے یہ اتنا بڑا کام انہیں محض اس لیے ملا ہے کہ آج انہوں نے آپا زمرد کی مبارک صورت گھر سے نکلتے وقت دیکھی تھی۔

وہ اس وقت سیدھے بڑے صاحب کے پاس جا رہے تھے۔ بڑے صاحب نے کسی حیل حجت کے بغیر ان کا ٹھیکہ منظور کر لیا۔

وہ ذرا رکی، ماں بیٹی کے چہروں پر نگاہ دوڑائی اور بات جاری رکھی!

ماموں آج بڑے خوش ہیں، اور گھر بھر میں ناچتے پھر رہے ہیں۔ کہ انہیں یہ ٹھیکہ محض آپا زمرد کی صورت دیکھنے سے ملا۔

ورنہ وہ کہہ رہے تھے کہ بڑے بڑے آدمی ان کے مقابلہ میں تھے۔

احمق زمرد کو اس وقت ایسا لگا جیسے یہ لڑکی، کوئی بڑی نجومی ہے اور اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر اسے اس کے اچھے مستقبل کی خبر دے رہی ہے۔ معمولی پڑھی لکھی، اور دنیا کے حالات سے بے خبر نوجوان لڑکی کی طرح اس زمرد کو آپ ہی آپ، اپنے مستقبل کے آسمان سے بدنصیبی کے گھنے بادل چھٹتے محسوس ہوئے۔

اور تھوڑی دیر بیٹھ کر جب محمودہ گھر لوٹ گئی۔

تو وہ اپنی بے وقوف ماں سے بالکل الھڑ بچیوں کی طرح پوچھنے لگی۔

ماں! کیا کسی کا چہرہ دیکھ لینے سے قسمت پلٹ جایا کرتی ہے۔

ماں پرانے دور کے عقیدوں کی بندھی ہوئی گٹھڑی تھی۔ اپنی چندھیائی چندھیائی آنکھوں کو بہت زور سے کھولتے ہوئے کہنے لگی۔

ہاں بیٹی! ایسا تو اکثر ہوتا ہے تمہارے باوا جب کتنی مدت بیکار رہنے کے بعد، بھرتی ہونے کے لیئے گھر سے باہر نکلے تھے تو حجن بیوی جی سے ٹکر ہو گئی تھی شام کو وہ ہنستے ہنستے گھر آئے، اور خوشخبری دی کپتان صاحب نے انہیں چن لیا۔

وہ ذرا کھانسی شائد مرے ہوئے شوہر کی محبت سینہ میں جوش مارنے لگی تھی پھر کسی قدر رک کر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

اس دن سے تمہارے باوا بیوی حجن صاحبہ کے بڑے قائل ہو گئے عید شبرات کے موقعہ پر تو خیر ان کو خوب دیتے ہی رہتے۔ پانچ سات روپیہ ان کی نذر بڑی پابندی سے کرتے۔

وہ جب یہ باتیں کہہ رہی تھی زمرد سوچ رہی تھی میں تو نہ بیوی ہوں نہ میں نے حج کیا ہے نہ کوئی اور ہی خوبی مجھ میں ہے پھر میرا چہرہ دیکھ لینے سے محمودہ کے ماموں کو اتنا بڑا کام کیسے مل گیا۔ یہ بات سوچتے سوچتے نہ جانے کیسے چودھری فقیر محمد کی لمبی لمبی قامت بھرا بھرا جسم اور کسرتی بازو اس کے ذہن کی تختی پر، یوں ابھر آئے جیسے چودھری کا مجسمہ، بہت دنوں سے اس کے دل کی کسی کوٹھڑی میں چھپا بیٹھا تھا۔ اور اپنی نمائش کے لیے کسی ایسے ہی موقعہ کی تلاش میں تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زمرد کو یہ چودھری فقیر محمد اپنی لمبی قامت، بھرے بھرے جسم اور چوڑے چکلے سینہ کی وجہ سے، بہت بھلا لگتا تھا۔ وہ اسے یوں تو کبھی کبھی دیکھتی تھی چودھری فقیر محمد کا مکان اس کے مکان سے کئی گھروں کے فاصلے پر تھا۔ لیکن جب اکھاڑے میں وہ روز صبح ورزش کرنے کے لئے آتا۔ وہ زمرد کے مکان کے عین سامنے بنا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ زمرد نے آج کے اس واقعہ سے پہلے کبھی یہ سوچا ہی نہ تھا۔ کہ چودھری فقیر محمد کے متعلق اس کے دل میں ایک اچھی خاصی گنجائش تھی۔ محمود اگر یہ تحفہ لے کر نہ آتی اور ماموں کے متعلق اس قسم کی باتیں نہ کرتی۔ تو زمرد کو اس گنجائش کا کبھی احساس ہی نہ ہوتا۔ وہ محبت کی طرف سے نہ آزاد لڑکی تھی۔ اور نہ ایسی بری تھی کہ محلے کے جوان لڑکوں کو بری نیت سے دیکھتی رہے۔

فقیر محمد کے سوا اس محلے میں کئی اور نوجوان لڑکے بھی تھے۔ مگر زمرد نے کبھی کسی لڑکے پر بری نگاہ نہ کی تھی۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ زمرد کے اندر جنسی احساس صرف اس وقت پیدا ہوا جب محمد خاں نے اسکے ہاتھ پیلے کرنے پر آمادگی ظاہر کی ورنہ شائد یہ جنسی احساس، اسکی تربیت کے خاموش گہوارہ میں مدتوں سویا پڑا رہتا۔

سیب، تمد تازہ تھے۔ امرود بھی خاصے عمدہ معلوم ہوتے تھے اور کیلے تو اتنے نفیس تھے۔ کہ زمرد کا جی چاہا۔ انہیں کھانے کی بجائے محفوظ کر لے۔ مگر یہ چیزیں محفوظ کرنے کے لئے نہیں آئی تھیں۔ ماں بیٹی نے رات کے کھانے کے بعد مزے لے لے کر کھائیں۔ ماں کو انہیں کھانے کے بعد نیند آگئی۔ مگر زمرد کو ان چیزوں نے ایک نئے ذہنی مخمصہ میں ڈال دیا۔ وہ اپنی چارپائی پر لیٹ تو گئی۔ مگر کتنی دیر رات تک وہ چودھری فقیر محمد کے متعلق بڑی اچھی اچھی باتیں سوچتی رہی۔

پھر نیند اس کے سراپا پر مسلط ہو گئی، خواب میں آدمی کا ذہن ظاہری پابندیوں اور رکھ رکھاؤ سے آزاد ہو جاتا ہے۔ زمرد کا ذہن بھی آزادی کی فضا میں اڑنے لگا تھا۔ وہ چودھری فقیر محمد کو اپنی ڈیوڑھی میں کھڑا دیکھ رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پھلوں سے بھری ہوئی ٹوکریاں تھیں اور وہ ان میں سے لال لال سیب، زمرد کی طرف اچھالتا، زمرد کی خوبصورت آنکھوں، بھرے بھرے گالوں اور رسیلے ہونٹوں کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔ زمرد ذرا شرما رہی تھی۔ ہنس ہنس کر یہ سیب لیتی جاتی۔ اور بار بار پکارتی جاتی۔

چودھری، تم تو مجھے اس دن سے بہت اچھے لگنے لگے تھے۔ جب تم نے دو سال پیچھے، مجھے اپنی دیوانی گائے کے ساتھ ٹکرا جانے سے بچایا تھا۔

صبح جب ماں نے اسے نماز کے لئے اٹھایا، تو وہ اسی قسم کے سہانے خواب دیکھ رہی تھی۔ وہ نیند سے بھری ہوئی آنکھیں مسلتی ہوئی، بہت خوشی خوشی چارپائی سے اٹھی۔ نل کے پاس آن کر وضو کیا۔ اور مصلیٰ پر جا کھڑی ہوئی۔ آج اس نے بڑے شوق سے نماز پڑھی۔ بڑے لمبے لمبے سجدے کئے، اور نماز ختم کرنے کے بعد بڑی ہی لمبی دعا مانگی، اس دعا میں فقیر محمد بھی شریک تھا۔ وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ اپنے خدا سے اس فقیر محمد کے اچھے مستقبل اور کاروبار میں ترقی کی بھیک مانگ رہی تھی

یہ فقیر محمد کا پہلا کامیاب چھاپہ تھا، زمرد بے وقوف کے دل پر۔ دوسرا چھاپہ اس نے دو دن چھوڑ کر، پہلے سے بھی زور کے ساتھ مارا۔ اس بار اس نے محمودہ کی وساطت نہیں سمجھی۔ منڈی سے لوٹتا ہوا خود ہی زمرد کی ڈیوڑھی میں آن پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں گوبھی کے ترو تازہ پھولوں سے بھری ایک ٹوکری تھی۔ گوبھی

نئی نئی چلی تھی اور بازار میں اتنی مہنگی تھی کہ زمرد جیسی غریب لڑکی اسے خریدنے کی ہمت نہ کر سکتی تھی۔ فقیر محمد نے ڈیوڑھی میں پہنچ کر زمرد کی ماں کو آواز دی، زمرد کی ماں چلنے پھرنے سے معذور تھی، جواب میں زمرد ڈیوڑھی پر آئی اور کسی قدر ڈیوڑھی میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

کون ہے۔

چودھری فقیر محمد نے اپنی آواز میں ایک اچھی خاصی لطافت پیدا کر کے جواب دیا!

یہ میں ہوں فقیر۔

نہ جانے کیسے زمرد کا سارا جسم کانپ گیا، اور آواز حلق میں بند ہو کر رہ گئی۔

فقیر محمد سمجھا، اس کی آواز زمرد کے کانوں تک نہیں پہنچی یا اگر پہنچی ہے تو وہ پہچان نہیں سکی اس لئے اس نے وضاحت کی۔

میں ہوں چودھری فقیر محمد محمودہ کا ماموں۔

وہ اس فقیر محمد کو بھلا کیسے نہ پہچانتی۔ جو رات سے اس کے ذہن پر مسلط تھا جس کے خواب وہ رات بھر دیکھتی رہی تھی۔ اس کی خاموشی نہ پہچاننے کے سبب نہ تھی وہ تو ڈیوڑھی سے لگی کھڑی، ایک عجیب قسم کے لطیف لرزے میں مبتلا تھی۔ اس کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دفعتاً پھر سو گئی ہے اور رات کی طرح خواب دیکھنے لگی ہے۔ یہ خواب ہی کی سی بات تھی۔ یہ فقیر محمد، آج تک اس کی ڈیوڑھی میں اس طرح نہ آیا تھا۔ یوں وہ اس کے محلے میں برسوں سے آباد تھا۔ مگر محلے میں آباد ہونا اور بات ہے، اور اس طرح ڈیوڑھی میں آنا اور چیز ہے، پھر وہ امیر آدمی کا بیٹا تھا۔ وہ چودھری تھا۔ اور زمرد تو محض ایک یتیم لڑکی تھی بے سہارا۔

وہ کتنی دیر تک گم سم کھڑی رہی تو اس کی ماں نے صحن میں بیٹھے بیٹھے انتہائی اضطراب کے ساتھ پوچھا۔

اری تو وہاں کیوں کھڑی ہے۔ یہ کس نے آواز دی تھی۔

ماں سے وہ کیسے کہتی، ماں یہ تو وہ فقیر محمد ہے۔ جس نے کل پھل بھیجا تھا اور جس کے متعلق میں پگلی رات بھر خواب دیکھتی رہی۔

ماں نے دوبارہ استفسار کیا تو زمرد کی بجائے فقیر محمد نے آواز صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

خالہ یہ میں ہوں فقیر محمد۔ آج ہماری آڑھت پر شاہدرہ سے بہت سی گوبھی آئی تھی۔ میں نے سوچا، تھوڑی سی گوبھی آپ کو بھی دے آؤں!

آپ کی زمرد کا مجھ پر بڑا احسان ہے نا۔ کل اس کی وجہ سے مجھے آسانی سے ٹھیکہ ملا!

وہ اس سے آگے شائد کچھ اور بھی کہتا۔ کہ زمرد کی آواز بہت ہولے سے کانپی

یہ تو آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے چودھری ہوتے ہوئے ہماری ڈیوڑھی میں قدم رکھا

فقیر محمد کو یہ بات سن کر ایسا لگا جیسے پہلے سے اس کا قد دفعتاً ایک فٹ اور اونچا ہو گیا ہے۔ اس کی چھاتی تن گئی۔ اور جذبات سے بھرا ہوا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ یہ دل ابھی اُچھل ہی رہا تھا کہ ماں نے لاٹھی کے سہارے چارپائی سے اٹھتے ہوئے، عجیب سرخوشی کے ساتھ پوچھا۔

مگر بیٹے یہ تم وہاں اب تک ڈیوڑھی میں کیوں کھڑے ہو، آگے کیوں نہیں آ گئے، تم تو ہمارے اپنے ہو، تم سے ایسا کیا پردہ ہے!

زمرد سوچنے لگی۔

سچ مچ چودھری فقیر محمد سے کس طرح پردہ کر سکتی ہوں، اس کے متعلق تو رات میں نے کیسے سہانے خواب دیکھے تھے۔

مگر جب فقیر محمد ڈیوڑھی سے نکل کر سامنے آیا تو اس کی اونچی قامت، اور بھرے بھرے جسم کو دیکھتے ہی زمرد پر شرم و حیا کے ہزاروں بوجھل پردے اچانک کہیں سے آن گرے اور وہ دیوار کے ساتھ اس طرح سمٹ گئی جیسے ان پردوں کے بوجھ سے پچنا چاہ رہی تھی چودھری فقیر محمد لمبے لمبے ڈگ بھرتا صحن میں بچھی چارپائی کے پاس جا پہنچا، ماں کو جھک کر بڑے ادب سے سلام کیا۔ اور ٹوکری میں سے ایک ایک کر کے سات پھول نکال کر ماں کے سامنے رکھ دیئے۔ ماں نے تعجب اور خوشی کے ملے جلے احساس کے ساتھ پوچھا۔

ارے بیٹے۔ اتنے سارے پھول کیا ہوں گے،،

وہ ہنس پڑا۔ کوئی جواب نہ بن پڑا۔ پھر ذرا دیر رک کر گوبھی کے ایک پھول کو ہاتھ میں تولتے ہوئے کہنے لگا۔

ماں۔ یہ ذرا ذرا سے تو پھول ہیں، میں تو اکیلا ایسے پانچ پھول ایک ہی وقت میں کھا جاؤں۔

ماں بھی ہنس پڑی۔

بیٹے، تو تو ماشاءاللہ پہلوان ہے، کثرت کرتا ہے، اتنا سارا جسم ہے اور ہم تو دونوں ماں بیٹی، دھان پان ہیں اور زمرد بے چاری تو اتنا تھوڑا کھاتی ہے کہ کچھ نہ پوچھو!

چودھری نے کن آنکھیوں سے اس تھوڑا کھانے والی زمرد کی طرف دیکھا وہ

ابھی تک دیوار کے ساتھ سمٹی کھڑی تھی۔ اس کی یہ ادا کتنی دلفریب اور کتنی پیاری تھی

فقیر محمد تڑپ ہی تو اٹھا!

فقیر محمد کی نگاہ سے ماں کی توجہ بھی ادھر ہو گئی تھی اس نے پیار سے زمرد کو ڈانٹا

اری زمرد تو وہاں دیوار کے ساتھ کیوں لگی کھڑی ہے۔

فقیر تو اپنا بیٹا ہے۔

ادھر آنا ـــــ اسے بیٹھنے کو کوئی کرسی لا دے!

زمرد سمٹی سمٹی، دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی دالان میں پہنچی، وہ جب کرسی اٹھا رہی تھی تو نہ جانے کیسے اسے وہ دن یاد آ گیا جب پہلے دن اس نے اسی طرح محمد خاں کے بیٹھنے کے لئے کرسی اٹھائی تھی۔ اس کے دل پر دو دھارے چاقو چل گئے۔ اس کا دماغ گھوم گیا۔ اور اس نے مجروح دل اور گھومتے ہوئے دماغ کے ساتھ سوچا

کہیں یہ آغاز بھی ویسے ہی انجام پر تو ختم نہیں ہو گا!

ماں کی آواز پہلے سے تیز ہو گئی تھی اور وہ فقیر سے کہہ رہی تھی۔

بیٹا کتنے دنوں کے بعد، آج ایک مرد کے پاؤں ہمارے گھر میں آئے ہیں۔ ہم بھی کتنی بدنصیب ہیں، کہ نہ کوئی مرد یہاں سے باہر نکلتا ہے اور نہ باہر سے اندر آتا ہے

آخر لفظوں پر، ماں کی آواز دھیمی ہو گئی۔ شائد یہ الفاظ کانپ گئے تھے۔ اور زمرد کرسی اٹھائے اٹھائے ہولے ہولے قدم اٹھاتی ماں کی اس بات کے حسن و قبح پر غور کر رہی تھی اور دل ہی دل میں ماں کی اس جلد بازی پر پیچ و تاب کھا رہی تھی محمد خاں کی یاد نے اس کے تصورات کی دنیا میں ایک کہرام مچا دیا تھا۔ اور وہ سوچنے لگی تھی۔ وہ بھی کتنی احمق ہے۔

رات کیسے بے کار اور بے بنیاد سے خواب دیکھتی رہی۔ وہ کرسی لے آئی۔ اور شرماتے شرماتے اسے فقیر محمد کے قریب بچھا دیا۔ تو نہ جانے کیوں وہ پہلے کی طرح نہ شرمائی۔ اس کے جسم پر پہلے کی طرح کوئی لرزا طاری نہیں ہوا، پہلے کی طرح اُسنے فقیر محمد کو اس شوق کے ساتھ نہ دیکھا جس شوق کے ساتھ اس نے اسے ڈیوڑھی سے نکلتے وقت دیکھا تھا۔

فقیر محمد کرسی پر بیٹھ گیا۔ تو اپنی اس وقت کی حرکت کے جواز میں دلیل بازی سے کام لیا، کہنے لگا۔

ماں! احسان ناشناسی، بہت بُری بات ہے۔ اور میں تو زمرد بہن کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا جو انہوں نے کل مجھ پر کیا۔

زمرد کا جی چاہا۔ کہے۔

چھوڑو بھی میاں فقیر محمد، ان رسمی باتوں میں کیا رکھا ہے تم آئے ہو تو بڑی مہربانی ہے۔ مگر یہ حیلے بہانے کس لئے ہیں۔

اس کے ذہن میں محمد خاں کی یاد نے یہ جو اچانک تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ یہ خواہش اسی کا نتیجہ تھی۔ مگر ماں ایسے کسی تصور سے متاثر نہ تھی۔ پرانے خیالات کی عورت تھی، اس نے بی جمن والی کہانی، فقیر خاں کو بھی اسی بے تکلفی کے ساتھ سنا دی جس طرح کل زمرد کو سنائی تھی۔

فقیر محمد کا دل بہت ہلکا ہو گیا۔ اور وہ جی ہی جی میں اگلے پروگرام مرتب کرنے لگا جب تھوڑی [illegible] سے جانے کی اجازت لی، تو آئندہ کیلئے گنجائش پیدا کرنے کی خاطر [illegible]

ماں! ہم یہی سبزی اور فروٹ کا کام کرتے ہیں۔ میں کبھی کبھی زمرد بہن کا احسان اُتارنے کے لئے کچھ نہ کچھ نذر کرتا رہوں گا۔

یہ کہتے وقت اس نے زمرد کی طرف دیکھا جو شرم وحیا کے مظاہرہ کے بغیر، قریب قریب سارا مُنہ کھولے، سامنے کھڑی تھی، اس کا چہرہ کتنا خوبصورت تھا اس کی آنکھوں میں کتنی مستی اور کیسا جادو تھا۔ فیقر کا جی چاہا دو قدم آگے بڑھے اور اس کے سامنے جُھک کر کہے۔

سرکار یہ تو محض بہانے ہیں ورنہ بات یہ ہے کہ بندے کا جی تمہارے اس حسین سراپے سے اُلجھ گیا ہے۔

مگر یہ پہلا دن تھا، اور پہلے دن ایسی بات کہنی احتیاط کے منافی تھی۔ فیقر زمرد کو کن انکھیوں سے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ اور ماں گوبھی کے پھولوں کو ہاتھوں میں اُچھالتی ذرا چھوٹی باتیں کرنے لگی۔

یہ پھول ایک ایک روپے سے کیا کم کا ہو گا۔ بے چارا کتنا اچھا ہے۔ یہ اتنے سارے پھول خود دے کر آیا!

وہ اچھا تھا یا بُرا۔ زمرد نے کوئی رائے بھی تو ظاہر نہ کی۔ اور ماں کو پھولوں کی قیمت کا اندازہ لگاتا چھوڑ کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ اور اپنی الماری کے قریب پہنچ کر، محمد خاں کی دی ہوئی ایک ایک چیز باہر نکال لی، اور مجروح عورت کی طرح سوچنے لگی۔

یہ مرد اتنے حقیر، اتنے تھوڑ دلے اور پست کیوں ہوتے ہیں۔ کہ ایسی معمولی معمولی چیزیں تحفے میں دے کر سمجھتے ہیں۔ عورت ان کے بارے میں تصورات

کے محل کھڑے کرے گی! احمق کہیں کے!

اور وہ آپ کتنی احمق تھی۔ چند سیب، کیلے اور امرود دیکھ کر، کتنی بلندیوں پر اُڑنے لگی تھی۔

ماں باہر گوبھی کاٹتی جاتی اور فقیر محمد کے لئے دعائیں کرتی جاتی اور اندر زمرد، انتہائی بے بسی اور بیچارگی کے احساس کے ساتھ اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

اس رات اس نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ وہ پوری رات سوئی بھی نہ تھی، صبح جب جاگی تو نماز میں کچھ زیادہ جی نہیں لگا۔ اور دعا مانگتے وقت، اس نے ہاتھ تو یقیناً اُٹھائے۔ مگر اپنے خدا سے کچھ کہہ نہ سکی، نہ اپنے متعلق۔ اور نہ اس فقیر محمد چودھری کے متعلق۔ مگر یہ فقیر محمد چودھری تو ہواؤں پر اُڑنے لگا تھا منہ اندھیرے ہی، پھر ڈیوڑھی میں آن پہنچا۔ اور کنڈی ہلا ہلا کر، زمرد کے ذہن پر ہتھوڑے چلانے لگا۔ وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر دروازہ پر گئی دروازہ کھولا اور پوچھا۔

کون ہ

فقیر محمد نے مکھن سے بھرا ہؤا کٹورا، سامنے کر دیا۔

زمرد نے کٹورا تو ہاتھ میں پکڑ لیا۔ مگر کچھ کہہ نہ سکی، چودھری کچھ عزم کر کے آیا تھا بہت ہولے سے پوچھا۔

ماں کہاں ہیں۔

زمرد کانپ گئی! کٹورا ہاتھ سے گرنے کو تھا کہ سنبھلی، جی چاہا، چودھری سے کہے۔ چودھری! خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو، میں پہلے ہی ایک بڑا زخم کھا چکی ہوں مجھے اور زخمی کرنے کی کوشش نہ کرو! تم تو مرد ہو۔ تمہیں تو کوئی احساس نہیں ہو گا۔

مگر میں تو ایک بے چاری مفلس جوان لڑکی ہوں!

یہ بات کہنے کے لئے جرأت کی ضرورت تھی اور زمرد میں اتنی جرأت نہ تھی۔ خاموش کھڑی رہی!

چودھری نے دوبارہ پوچھا،

ماں کہاں ہیں۔

زمرد کی آواز کانپی۔

کیوں، ماں سے کچھ کام ہے۔

چودھری نے ہولے سے کہا۔

نہیں تو! میں تو!

زمرد سمجھ گئی۔ اس "میں تو" سے اس چودھری کی کیا مراد ہے۔ اور اس نے بڑی بے رخی کے ساتھ جواب دیا۔

ماں اوپر کمرے میں بیٹھی قرآن پڑھ رہی ہیں۔

چودھری آپ ہی آپ اندر بڑھ آیا اور زمرد کے سامنے اسطرح رکوع کے بل جھک گیا۔ جیسے وہ کوئی بت تھی۔ اس کی حالت اس وقت سچ مچ ایک بت کی تھی۔ چودھری اس کے سامنے جھکا کھڑا رہا۔ اور وہ بے جان بت کی طرح اسے دیکھتی رہی، یہ تو آپ ہی چودھری نے اپنے سر اٹھایا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر التجا کی

مجھ پر رحم کرو!

زمرد کا جی چاہا کہے۔

چودھری رحم کی تو میں محتاج ہوں رحم تو مجھ پر کرو۔ مگر وہ بات بھی کہہ نہ

سکی اور چودھری نے گنجائش دیکھ کر، اگلا قدم اٹھایا۔

بولا!

میں ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں، ہر شرط پوری کر سکتا ہوں۔

زمرد کو نہ جانے کیسے زبان مل گئی۔

مگر قیمت کس بات کی، اور شرط کیسی۔

چودھری گھبرا جانے کو تھا۔ سمجھدار تھا بات بنائی!

تم بچی نہیں ہو زمرد، تمہیں معلوم ہے۔ میری مراد کیا ہے۔

زمرد نے پوری بے باکی سے پوچھا!

کیا آپ میرا جسم خریدنا چاہتے ہیں، یا میری روح کے طالب ہیں

چودھری کا ذہن ان باریکیوں سے خالی تھا جواب دیا!

میں تمہیں چاہتا ہوں، تمہارے حسن نے مجھ پر جادو کر دیا ہے اور میں تمہارے بغیر ایک پل زندہ نہیں رہ سکتا۔

ایسی ہی باتیں محمد خان نے بھی کئی بار زمرد سے کہی تھیں۔ مگر وہ نہ صرف تین مہینے زندہ رہا بلکہ دوسرے دن کو موت کی نیند سلانے لام پر چلا گیا۔ زمرد نے محمد خاں کی یہ باتیں سوچ کر چودھری سے صاف بات کہہ دی۔

چودھری تمہیں شائد، میری بات کچھ عجیب تو لگے۔ لیکن میں نہیں چاہتی۔ کوئی غلط فہمی پیدا ہو اگر تم بھری محفل میں، ساری برادری، سارے محلے والوں کے سامنے میرے ہاتھ پیلے کر سکتے ہو، مجھے بیاہ کر اپنے گھر لے جانے کی ہمت رکھتے ہو پھر، اگر تم چاہو میں تمہارے پاؤں پر سر رکھ دوں تو بھی مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔

لیکن ایسے ہی اگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ اس سے آگے کچھ کہہ نہ سکی۔ فقیر محمد بھی کچھ سنبھل سا گیا۔ زمرد بڑی خوبصورت تھی۔ مگر اس کے باپ نے بھری محفل میں ساری برادری کے روبرو اس کی منگنی اپنے جیسے بڑے چودھری کی بیٹی سے کی تھی۔ وہ گو اتنی خوبصورت نہ تھی مگر اس کے باپ کے پاس بڑی دولت تھی بڑا پیسہ تھا۔ اور ٹھیکے کے کام میں پیسہ بہت ضروری ہوتا ہے۔ فقیر محمد نے تھوڑی دیر میں اتنی ساری باتیں سوچ ڈالیں۔ ذرا تیز آدمی تھا! ایک اور پینترا بدلا کہنے لگا!

زمرد! تم نے جو بات کہی ہے! یہ تو بہت بعد میں سوچنے کی ہے۔ ابھی۔ ابھی ہم تم اسے سوچتے اچھے نہیں لگتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ابھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

زمرد نے بات کاٹ لی۔

ابھی کا مطلب ہے، آپ چند دن میری جوانی سے کھیلیں اور میں آپکے جسم سے! جی!

یہ کہہ کر اس نے مکھن کا کٹورا بہت زور سے سامنے کی دیوار کے ساتھ دے مارا۔ اور بغیر کچھ کہے! اندر چلی گئی، اور چارپائی پر گر کر اس طرح رونے لگی۔ جیسے اس کے باپ کی موت کی خبر ابھی ابھی اسے ملی تھی۔

فقیر محمد، کھیل بگڑتا دیکھ کر، خالی کٹورا، اٹھا کر جیسے آیا تھا ویسے ہی چل دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بات چھپی نہیں رہتی۔ فقیر محمد کے دل کی بات بھی چھپی نہ رہی۔ محلہ کا معاملہ تھا

اس کے باپ سے کسی جاننے والے نے فقیر محمد کی آمد و رفت کا سارا قصہ کہہ دیا، وہ چودھری تھا، اسی شام، چودھرائن کو ساتھ لے کر زمرد کی ماں کے پاس پہنچا اور وہ طوفان مچایا کہ سارا محلہ بھڑک اُٹھا۔ اور غریب زمرد نے تو غم کے مارے اپنے کتنے ہی بال نوچ لئے۔

فقیر محمد اسی ہفتے بڑے چودھری کی بیٹی سے بیاہ دیا گیا۔ مگر محلے میں زمرد اس طرح بدنام ہو گئی جیسے کوئی بڑی فاحشہ یا آوارہ تھی۔

اس بدنامی کے باوجود محلے کے دودھ والے کے بیٹے نے قسمت آزمائی کی اور ہر صبح و شام دودھ کے جگ لے لے کر، زمرد کی ماں کے پاس پہنچنے لگا۔ ذرا عقل مند تھا رات کو اس وقت آتا جب بہت رات چلی گئی ہوتی، اور صبح کو بھی بہت منہ اندھیرے اس گھر کا رُخ کرتا!

زمرد کے حواس ٹھکانے نہ تھے۔ وہ آگا پیچھا سوچنے بغیر، اس دودھ والے کے بیٹے سے نہ صرف دودھ ہی قبول کر لیتی۔ بلکہ کبھی کبھی اس سے میٹھی میٹھی باتیں بھی کرتی۔ یہ محبت ہوتے ہوتے پروان چڑھنے لگی دودھ والا، ان پڑھ مخلص تھا۔ غریب نوجوان تھا اس لئے، کتنے مہینے تک، زمرد کے لئے آہیں بھی بھر بن نالے بھی کئیے۔ اور جب لوگوں نے اس کے دل کی بات جان لی، تو بازار کے بیچ میں کھڑے ہو کر سینہ پر ہاتھ مار کر اعلان کیا۔

ہم اس زمرد بیگم کو بیاہ کر لائیں گے، جس ماں نے ایسا لال جنا ہے جو ہمیں روک سکے۔

بوڑھا حلوائی بھی اس کی یہ تقریر سن رہا تھا۔ اس وقت تو اس نے کچھ

نہیں کہا۔ شام کو جب وہ دوکان کے پچھلے حصہ میں حسب معمول، اپنے ساتھیوں سے تاش کھیلنے بیٹھا تو بوڑھا چپکے سے دوکان سے نکلا، جب لوٹا تو اس کے ساتھ چھوٹا تھانیدار اور تین سپاہی بھی تھے۔

نوجوان چھوکرا اور اس کے چاروں ساتھی جوئے کے الزام میں پکڑے گئے رات حوالات میں کٹی۔ صبح چالان ہوا۔

دوسرے باپ اپنے بیٹوں کی ضمانت دے کر بیٹوں کو چھڑا لے گئے۔ ننھو بے چارا بغیر ضمانت کے پھر حوالات میں پہنچا۔ اس ہفتہ تینوں ساتھی بری ہو گئے مگر ننھو کو تین مہینے کی سزا ہو گئی۔ اور زمرد کو اس طرح لگا جیسے، وہ اپنے صحن میں مٹی کے جس گھروندے سے بیٹھی کھیل رہی تھی وہ موسلا دھار بارش کی مار سے ٹوٹ پھوٹ کر بہ گیا ہے۔

پھر اس کے دل سے احساس سود و زیاں جاتا رہا۔ اس کے حواس کی وہ کشتی اُلٹ گئی جو کبھی پانی کے تیز دھارے پر بھی پوری روانی کے ساتھ بہتی رہی کئی لوگ اسے آوارہ کہتے۔ محلہ بھر کی عورتیں اسے دیکھ کر اس پر تھو کرتیں۔ وہ اس الزام پر کچھ نہ سوچتی۔ عورتیں جب اس کے منہ پر تھوکتیں تو وہ ان سے یہ بھی نہ کہتی۔ میں نے کوئی بُرا نہیں کیا

فہیم اس کی ماں کے دور کے رشتہ داروں میں تھا، اس کی آوارگی کی شہرت اسے اس تک کھینچ لائی، وہ اپنے مالک کے لئے، آوارہ عورتوں کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں کے چکر کاٹا کرتا تھا۔ اس نے سوچا، اگر زمرد آوارہ ہو گئی ہے تو اسے بھی کیوں نہ صاحب کے پاس لے چلے۔

یہ عجیب بات تھی کہ زمرد، فہیم کے آنے سے پہلے، کبھی آوارہ نہ پھری تھی۔ کبھی رات کے وقت گھر سے باہر نہ نکلی تھی اور نہ گھر سے باہر راتیں بسر کرنے کا خیال ہی اسے آیا تھا۔ مگر فہیم نے جیسے ہی اشارہ اشارہ میں اپنے مالک کے مزاج کی بات اس سے کی اور اپنے سے اسے باخبر کیا، تو وہ اس کام میں مشّاق عورتوں کی طرح مسکرا پڑی اور فہیم سے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

دیکھو، ماں جب رات کو دس بجے کے قریب سو جائے، تو اس وقت میں آپ ہی ڈیوڑھی میں آجاؤں گی، تم بھی اس وقت آجانا! پھر . . . .

فہیم مسکرایا۔ اور خوش خوش چلا گیا۔ زمرد، ان ساری عورتوں سے زیادہ خوبصورت رعنا، اور دلفریب تھی جو اس کی وساطت سے میجر منّو تک پہنچیں۔ فہیم پھولا نہ سماتا تھا کہ آج، جب زمرد صاحب کے پاس آئے گی، تو صاحب اسے مُنہ مانگا انعام دیں گے۔

اس رات تو صاحب، اتنی پی گیا تھا کہ اسے انعام دینے کی بات یاد نہ رہی، دوسری رات وہ اتنا اُلجھ گیا تھا اتنا کھو گیا تھا۔ کہ فہیم سے بات تک نہ کر سکا البتہ آگرہ روانہ ہونے سے پہلے، اس نے، زمرد کے ساتھ موٹر میں لدتے وقت فہیم کو تھوڑے نہیں اکٹھے پانچسو روپے بخش دیئے۔ اور فہیم کو ایسا لگا جیسے۔ یا تو صاحب حواس میں نہیں ہے۔ یا اس کے اپنے حواس رخصت ہو چکے ہیں مگر صاحب بھی ہوش میں تھا اور فہیم بھی۔ صاحب کی حالت کا تو فہیم کو اس وقت پتہ چلا۔ جب فہیم نے آگرہ کی طرف موٹر ڈرائیو کرتے وقت صاحب کو زمرد سے ہوئے ہوئے کہتے سُنا!

زمرد تم شاید یقین نہ کرو گی۔ میں نے اپنی زندگی میں تم جیسی نہ کوئی دل فریب اور شیریں لڑکی دیکھی اور نہ میں کبھی کسی لڑکی سے اس قدر متاثر ہؤا۔

خدا جانتا ہے۔ تم تو دنیا کی سب سے بڑی جادوگر ہو! تم نے تو میرے حواس پر کچھ ایسا اثر ڈالا ہے کہ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی تم مجھ سے چھین لی جاؤ تو میری چلتی سانس رُک جائے۔

یقین جانو! اگر تمہاری خاطر، مجھے ساری دنیا سے لڑنا پڑے۔ تو میں کبھی تامل نہ کروں گا۔ دنیا جہاں کی قوتیں اپنے ہر اسلحہ سے مسلح ہو کر مجھے تم سے جدا کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ تو میں ہر قوت سے لڑوں گا۔ ہر آندھی کا مقابلہ کروں گا۔ ہر طوفان کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوں گا۔

اس وقت جب وہ یہ اتنی بڑی بات زمرد سے کہہ رہا تھا زمرد کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ یہ آنسو بہاتی زمرد، منو کو اس درجہ حسین معلوم ہوئی کہ وہ بے اختیار اس کے پاؤں پر جھک گیا اور زمرد سسکیاں بھرنے لگی۔

فہیم کے موٹر کے ہینڈل پر رکھے ہاتھ کانپ اُٹھے تھے اور موٹر لہرانے لگی تھی۔ اور اگر وہ دل پر پورا قابو نہ رکھتا تو موٹر سڑک سے اس طرح لڑھک گئی ہوتی جیسے وہ محض، ایک حقیر سائیکل تھی۔

زمرد نے سسکیاں بھرتے بھرتے۔ فہیم کے حواس پر ایک اور بم پھینکا۔ وہ ٹوٹے ٹوٹے الفاظ میں کہہ رہی تھی!

آقا! آپ نے اس حقیر۔ اس انتہائی ذلیل۔ بے بس۔ محتاج۔ مفلس، اور لوگوں کی نگاہوں میں پرلے درجہ کی آوارہ لڑکی کو اپنا لیا ہے۔ . . . .

میں اس پر کس طرح شکریہ ادا کروں۔ نہ ہمت رکھتی ہوں۔ نہ جرات کی دولت دامن میں بھری پڑی صرف ایک وجود ہے۔ حقیر سا وجود، صرف ایک محبت ہے۔ حقیر سی محبت، صرف ایک دل ہے مجروح سا دل۔

یہ آپ کے قدموں میں ہے۔ یہ جو کچھ میرے پاس تھا۔ آپ کا ہے۔ آپ چاہیں اسے ذبح لیں۔ اور گدھوں کے سامنے ڈال دیں۔

منو نے اسی کی طرح روتے ہوئے اسے اپنے سینہ سے اس طرح بھینچ لیا تھا۔ جیسے کوئی غیر مرئی قوت اسے اس سے چھیننے کے لئے آن پہنچی تھی۔

روضہ تاج محل کے سایہ میں پہنچ کر، اس کی جالیوں کے ساتھ لگ لگ کر، منو نے اس زمرد کو ایک بار نہیں کوئی سو بار اپنے سینہ سے بھینچا تھا۔ اور یہی بات دہرائی تھی۔ ہر بار جب اس نے زمرد سے اپنی محبت کی بات کہی، زمرد بچوں کی طرح رو رو پڑی۔

مگر اس وقت جب آسمان کے چہرے سے بادل کی ٹکڑیاں چھٹ گئی تھیں اور بیسویں رات کا چاند پوری تابانی کے ساتھ چمکنے لگا تھا۔ زمرد منو کے سینہ سے لگی نہ روئی، نہ آہیں بھریں۔ اس وقت تو اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر ممتاز محل کی اور اس کے محبوب کے اندر شاہ جہاں کی روح آن سمائی ہے اور دونوں کے سروں پر اس محبت نے انتہائی مقدس اور چمکیلے تاج رکھ دیئے ہیں۔ یہ چاندنی رات، زمرد نے تو خیر کبھی دیکھی نہ تھی۔ وہ تو بیچاری کبھی اس تاج محل میں آئی نہ تھی کبھی اس جنت میں قدم نہ رکھے تھے۔ مگر یہ منو جیسے تاج محل کی کتنی ہی چاندنی راتیں دیکھی تھیں، ان چاندنی راتوں میں کیسے کیسے کھیل کھیلے تھے۔ سچ مچ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے آج تک اس نے کبھی کوئی چاندنی رات اس تاج محل میں بسر نہ کی تھی۔

اس زمرد نے اس بے فکرے، اس شرابی، اور انتہائی بے پروا منّو کو ایک
ایسی دنیا میں لا اتارا تھا جہاں، محبت کے پھول کھلے تھے ۔

حسن کی ندیاں بہ رہی تھیں اور رعنائیوں کے آبشار گنگنا رہے تھے خود زمرد ماضی کی ہر تلخی بھول گئی تھی۔ اسے ایک لمحہ ایک آن اور ایک گھڑی کے لیے بھی نہ محمد خاں یاد آیا تھا، نہ فقیر محمد اور نہ نتھو کے منحوس سایہ نے اس کے ذہن پر کوئی بوجھ لادا تھا۔ وہ تو ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے بچپن کی وادی سے نکل کر آج ہی جوانی دیوانی کے حدود میں پہنچی ہے۔ اور اس کی جوانی کی نگاہ جس پہلے مرد رعنا پر پڑی ہے۔ وہ صرف منّو ہے۔ وہ صرف یہ چھ فٹ کا لمبا تڑنگا، ایرانی شعرا کی محبوب عورتوں کی طرح سرو قد میجر منور احمد خاں ہے منو نے اسے اپنے خاندانی نام، اپنی ریاست، اپنی ماں رانی شمیم پور اور اپنے مرحوم ابا راجہ شمیم پور کے متعلق ایک ایک بات کہہ دی تھی۔ اور جب زمرد نے عجیب بھولے پن سے پوچھا تھا۔ اگر انہوں نے، مجھ ذرۂ ناچیز کو اپنی بہو بنانے سے انکار کر دیا تو ۔

منّو کچھ سکتے میں پڑ گیا تھا۔ اور کچھ دیر رک رک کر کہا تھا۔ اگر انہوں نے تمہیں میری بیوی بننے کی اجازت نہ دی! تو میں تم سے رسمی نکاح تو نہیں کروں گا۔

لیکن تم خدائے بزرگ و برتر، اس کے سارے فرشتوں کے روبرو، میری روح کی بیوی بنو گی۔ مجھے اور تمہیں یقیناً کوئی مولوی رشتہ ازدواج میں منسلک نہ کرے گا کہ میری ماں کی اجازت کے بغیر ہمارے گھرانے کا کوئی بیٹا شرعی نکاح کرنے کا مجاز نہیں رکھا گیا۔ ہمارے ہر فرد سے پندرھویں سال میں قدم رکھتے ہی قرآن حکیم کو شاہد مان کر قسم لی جاتی ہے کہ ہم اپنی ماں کی اجازت کے بغیر اپنا نکاح نہیں کر سکیں گے۔

اس وقت ایک لمحہ کے لیے زمرد کے خوبصورت اور انتہائی دلفریب چہرہ پر کچھ زردی کا سی جھلک آ گئی تھی مگر منور نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا سر اس کے گھٹنوں پر رکھ کر اس سے کہا۔

ارے میرے دل و جان کی مالک میں تاج محل کے اس حسین گنبد، اس کی مقدس جالیوں ممتاز کی معصومیت شاہجہاں کے اخلاص اور اس چاندنی رات اس میں پھیلے فرشتوں، ہزاروں پھولوں، پتیوں اور گھاس کے ان تختوں کی قسم کھاتا ہوں کہ تجھ سے کبھی بے وفائی نہیں کروں گا۔ اور میری زندگی میں اور تیری موت کے بعد کبھی کسی عورت سے رشتہ مناکحت قائم نہیں کروں گا۔

اور اگر تجھے مجھ پر بھروسہ نہ ہو! تو میں دنیا کی ہر بڑی سے بڑی عدالت میں حاضر ہو کر۔ تمہارے حضور یہ اقرار کرنے کے لیے تیار رہوں۔

میری ماں کی پابندی، صرف نکاح کرنے پر ہے: نکاح نہ کرنے پر دنیا کی کوئی قوت مجھے پابند نہیں کر سکتی۔

زمرد کے چہرہ پر اس گھڑی جو سرخی جھلک آئی تھی۔ وہ تو خدا کے حسن کا پرتو تھی وہ تو تجلی تھی جیسے موسیٰ نے سر کوہ طور دیکھا تھا۔ اور ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ منور بھی آدم زاد تھا۔ اس کے اوپر بھی یہ تجلی دیکھ کر موسیٰ سے کوئی کم اثر نہیں ہوا۔ اس نے اپنی پیشانی۔ زمرد کے گھٹنوں پر سے اٹھا کر اس کے نازک نازک حسین پاؤں پر رکھ دی۔

چاند نے ایک زور کا قہقہہ مارا، تاروں کی بے نور شمعیں دمک اٹھیں۔ ہوا تیز تیز چلنے لگی۔ چاندنی پہلے سے ہزار گنا تیز ہو گئی اور زمرد اپنی جگہ سے یوں اٹھ کھڑی ہوئی جیسے زلزلہ آ گیا تھا۔

چوتھا باب

زلزلہ کے یہی جھٹکے بنتو میاں کے ماموں، کرنیل نواز جنگ، اسکی ماں، رانی شمیم پور اور اس کی خالہ رانی مہدی پور اور ان کے ساتھیوں کو بھی ہر سو لہراتے محسوس ہو رہے تھے۔ یہ لوگ۔ نزہت کے پراپیگنڈا سے متاثر ہو کر شمیم پور اور مہدی پور سے یہاں آئے تھے۔ یہ سب اودھ کے پُرانے تعلقہ دار خاندانوں کے وارث تھے۔ انہیں محض رسمی وراثتیں ہی نہ پہنچیں تھیں۔ بڑی لمبی چوڑی جاگیریں، محلات اور غرور و تمکنت کے خزانے بھی اپنے بزرگوں سے ملے تھے اور یہ سب کے سب کبھی اور کسی طرح بھی یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ راجہ شمیم پور کا منجھلا بیٹا ایک ایسی لڑکی سے شادی کرے جسے اس کے محلہ کا ایک معمولی دودھ دہی بیچنے والا اپنی بہو بنانا عار سمجھتا تھا۔ ظالم نزہت نے اس زمرد کے متعلق ایک ایک بات معلوم کر لی تھی۔ اور یہ سارے افسانے، محمد خان فقیر محمد اور ننھو کی روئدادوں کے ساتھ، ان لوگوں کے گوش گزار کر دئے تھے۔ اور ان میں سے ایک ایک کا جی چاہ رہا تھا وہ آگرہ جائیں۔ اس میجر منو کو زنجیروں میں جکڑ کر اسکے سامنے اس زمرد بیگم کو سنگسار کریں۔ جس نے ان کی خاندانی آبرو پر اس طرح چوٹ کی تھی۔ رانی صاحبہ شمیم پور سب سے زیادہ غصہ میں تھیں۔ اور نزہت کے کندھوں کو بہت زور کیساتھ سہلاتی ہوئی اس سے طعن کر رہی تھیں۔

بیٹی مگر تم نے یہ سارا ہنگامہ اس وقت کھڑا کیا جب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ جب منو۔

نزہت کچھ کہنے کو تھی لیکن کرنیل صاحب نے اسے ہاتھ کے اشارہ سے

رک کر اس طعن کا جواب آپ دیا۔

آپا نزہ کو کیا کہتی ہو، نزہ بے چاری نے، تو اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے وہ شائد تم بھی نہ کر سکیتں۔

وہ ذرا اُڑ کے نزہ کے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

تم دیکھتی نہیں ہو۔ اس کے خوبصورت چہرہ پر منو کی اس حرکت نے کیسی زردی مسلط کر دی ہے۔ اس کے بال کس طرح اُلجھ گئے ہیں۔ اور وہ لڑکی جو ہر لمحہ قہقہے لگاتی۔ بات بات پر تمہارے اس بیٹے کی وجہ سے کتنی اداس اور کتنی پریشان ہو گئی ہے۔

رانی صاحبہ نے آگے کی طرف ہو کر نزہت کے چہرے کو دیکھا اور شائد عورت کی بینائی نے ان سے کوئی عجیب بات کہہ دی! وہ آبدیدہ سی ہو گئیں اور نزہت نے اپنی پیشانی پر گری ہوئی لٹیں، اپنے ایک ہاتھ سے اسطرح پیچھے کریں جیسے رانی صاحبہ کی متجسانہ نگاہوں سے ڈر گئی ہو۔

رانی صاحبہ کو اس کی یہ ادا اتنی بھلی معلوم ہوئی کہ انہوں نے اسکی پیشانی چوم لی۔ اور انتہائی حسرت کے ساتھ کرنل صاحب سے کہا۔

کتنا بدنصیب ہے منو جس نے اس جیسی چاند ایسی لڑکی کے مقابلہ میں اس دو پیسے کی آوارہ چھوکری کو پسند کیا ہے۔

جب وہ یہ کہہ رہی تھی نزہ کا جی چاہ رہا تھا۔ اس لمحہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں گڑ جائے۔ اس نے آج تک ایک لمحہ کے لئے بھی یہ بات سوچی نہ تھی کہ منو اور اس میں عورت مرد یا میاں بیوی کا بھی رشتہ پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ تو عورتوں کے ایک ایسے گروہ سے تعلق رکھتی تھی۔ جنہوں نے مردوں کی ضرورت کبھی محسوس نہ کرنے کا عزم

کر رکھا تھا۔

منّو کی اس حرکت پر اس نے یہ تماشے اس لئے نہیں کھڑے کئے تھے کہ وہ منّو سے کوئی جنسی تعلق رکھتی تھی یا آئندہ چل کر کوئی ایسا رشتہ قائم کرنے کی آرزومند تھی۔

اس کا جی چاہا رانی جی سے کہے۔

رانی جی! آپ میری بزرگ ہیں، لیکن آپ نے میرے چہرے کے پیلے پن، میرے بالوں کے الجھاؤ اور میری پریشانی سے جو رائے قائم کی ہے وہ قطعاً غلط ہے۔ منّو میرا دوست تھا، ایک رفیق، ایک ہم خیال یہ صحیح کہ وہ مجھے اپنے سارے دوستوں سے زیادہ پیارا تھا۔ میں اس کے لئے ہر قربانی کر سکتی تھی۔ مگر میں اسے اپنا شوہر کبھی بنانے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ یہ میرے آدرش میرے مقصد حیات اور تربیت کے قطعاً منافی ہے۔ البتہ میرا جی یہ ضرور چاہتا تھا کہ منّو، چھمی یا سورن سے بیاہ کر لیتا۔ منّو نے۔ میرے سامنے سورن کو کچھ ایسی امیدیں دلائی تھیں جن سے سورن کو تو کیا مجھے بھی۔ یقین تھا کہ سورن سے سول میرج کرے گا۔

ابھی وہ یہ سوچ رہی تھی۔ کہ کرنیل صاحب نے اس کے بالوں میں اپنی موٹی موٹی انگلیاں ڈال دیں اور بہن کے حسرت بھرے اظہار کو پہلے سے زیادہ مؤثر بنانے کی کوشش کی۔

آپا۔ تم تو نرمرد سے اس کا مقابلہ کر کے اس کی توہین کر رہی ہو، یہ تو ہندوستان کی دس کروڑ لڑکیوں سے زیادہ اچھی۔ زیادہ ذہین اور زیادہ خوبصورت ہے۔

انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

ہائے میرا کوئی جوان بیٹا نہیں، اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میں نزہت کا ہاتھ

اس کے ہاتھ میں دے کر کہتا۔

بیٹے۔ ہندوستان کی مادرِ بھومی اس جیسی حسین، اس ایسی ذہین اور شستہ تعلیق لڑکی جننے کے بعد بانجھ ہو گئی ہے۔

یہ لڑکی ہنس دیوی ہے۔ اور میں اس کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں اس لیئے دے رہا ہوں کہ تو اسکی پوجا کرے اسکے حسین پاؤں میں ہر صبح، ہر شام اپنا سر رکھے۔

رانی جی بے ساختہ مسکرا پڑیں اور بات کاٹ لی۔

بھیا، تم تو یہ کفر کی باتیں کرنے لگے۔ یہ تو تم اپنے بیٹے کو صریحاً شرک کی تعلیم دیتے ہو۔

کرنل صاحب نے ایک اور آہ بھری! اور اپنے اس شرک پر اصرار کیا۔

آپا، یہ کفر نہیں، اسے شرک نہیں کہتے۔ یہ تو خدا کی بالواسطہ عبادت ہے یہ تو اس بات کا اعتراف ہے۔ کہ خدا نے اس دنیا کو ایک ایسا حسین اور ایسا مقدس تحفہ عطا کیا۔

نزہت ڈوبے ڈوبے دل اور حیران حیران دماغ کے ساتھ یہ اتنی عجیب باتیں سن رہی تھی۔ اور اس کے تحت الشعور میں بیٹھی عورت اس کے دل کے کان میں کہہ رہی تھی۔

کیا تو ایسے سجدے قبول کر لیتی۔ کیا تو آدمیت کی گراوٹ کو پسند کرتی۔

رانی صاحبہ موج میں آگئی تھیں۔ ان کے دل نے شاید ان سے دفعتاً کوئی عجیب خوشی کی بات کہہ دی تھی۔ وہ بے ساختہ ہنسنے لگیں اور نزہت کو اپنے سینہ سے بھینچتے ہوئے بھائی سے کہا۔

بھیا! منصور کی شادی گو ہو چکی ہے۔ لیکن اگر تمہیں نزہت اتنی پسند ہے تو میں منصور کو حکم دوں گی۔ اپنی بیوی کو چھوڑ دے اور نزہت کو اپنی بیوی بنالے

کرنیل اپنی لانبی مونچھوں کو تاؤ دینے لگے۔ انہیں یہ بات کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ یہ تو نزہت کی شان کے خلاف بات تھی۔ یہ تو اس کے معیار سے بہت گھٹیا درجہ کا اقدام تھا۔

البتہ انہوں نے سوچا۔ اگر ان کی دوسری بہن مہدی پور کی رانی۔ اپنے بڑے بیٹے سے اس نزہت کا بیاہ کر لے۔ تو بہت اچھی بات ہے۔ اور انہوں نے اپنی اس بہن کو، جو لان کے دوسرے کونے میں بیٹھی۔ اپنی نند سے نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ ادھر کی طرف بلایا۔ کرنیل صاحب کی یہ بہن۔ کرنیل صاحب سے کئی سال چھوٹی تھیں۔ اور ابھی تک ان کے چہرے پر وہ جلال موجود تھا جو خوبصورت عورتوں کو خدا کی طرف سے جوانی میں عطا کیا جاتا ہے۔ وہ ادھر آئیں تو نزہت نے انہیں دیکھ کر اُٹھنے کی کوشش کی مگر بڑی آپا ابھی تک اس کے سر کو اپنے ہاتھوں میں تھامے تھیں۔ وہ اُٹھ نہ سکی۔ کرنیل صاحب نے اپنی اس عزیز بہن کا ایک ہاتھ پکڑ کر نزہت کے سر پہ رکھ دیا اور عجیب سرخوشی کے ساتھ کہنے لگے۔

سنجیدہ بیگم۔ اگر یہ نزہت تمہاری بہو بنادی جائے تو کیسی رہے کیا تم خوشی سے آپے سے باہر نہ ہو جاؤ گی۔

سنجیدہ بیگم نے نزہت کے بالوں سے کھیلتے ہوئے انتہائی حیرانی کے ساتھ پوچھا۔

مگر بھائی جان۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نزہت تو منو کے . . . .

کرنیل صاحب نے سنجیدہ بیگم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ آگے کچھ کہہ نہ سکی البتہ رانی شمیم پور نے احتجاج کیا۔

لیکن بھیا۔ یہ تو میری حق تلفی ہو گی۔ تم میری حویلی کی دولت، میری اوڑھنی کا جھالر، سنجیدہ کے ماتھے کی زینت بنانا چاہتے ہو۔

یہ کہتے ہوئے اس نے نزہت کو بڑی بے تابی کے ساتھ اپنے سینہ سے لگا لیا۔ کرنیل صاحب بے اختیار ہنس پڑے اور ہنستے ہنستے کہنے لگے۔

بھئی۔ یہ تو تمہارے منتوں نے آپ ہی پینڈ دکھا دی۔ آپ ہی لکشمی دیوی پر تمہارے گھر کے دروازے بند کر دیئے۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔

بڑی رانی نے شور مچایا۔

میں نے کہہ دیا بھیا، منتوں سہی، منصور جو ہے میں اپنی نزہت کو اسکی دلہن بناؤں گی۔

سنجیدہ بیگم نے اپنی ناک پر حیرت سے انگلی رکھتے ہوئے، پوچھا۔

اری آپا، یہ تم کیسی بات کر رہی ہو۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے۔

رانی شمیم پور کو دفعتاً یاد آیا ارے، منصور کی بیوی تو سنجیدہ کے خاوند کی پھوپھی زاد بہن ہے۔ انہوں نے بات بنائی۔

اری سنجیدہ، ہمارے خاندان میں دو دو بیویاں رکھنے کا تو عام دستور ہے۔ اگر منصور نے دوسری کر لی تو کیا برا کرے گا۔

اور پھر۔ . . . . . .

کرنیل صاحب نے اپنی مونچھوں کو بہت زور سے مروڑا۔

غصّہ میں بولے۔

تم تو آپا، بے وقوفی پہ اتر آئی ہو۔ ایسی فضول فضول باتیں سوچنے لگی ہو۔
پھر نہ جانے انہیں کیا سوجھی، نزہت سے کہنے لگے۔

چلو بیٹی اپنے گھر چلیں، یہ تو دونوں ساری عمر اسی طرح لڑتی رہیں گی بچپن میں بھی، ان کے یہی جھگڑے تھے۔ اور اب بوڑھی ہو رہی ہیں مگر پرانی عادت نہیں چھوڑی!

ابھی وہ اپنی بات پوری نہ کر پائے تھے۔ کہ دفعتاً منّو کی موٹر ہارن بجاتی بنگلے کے برآمدہ کے قریب آن رکی۔ اور ان سب کو ایسے محسوس ہوا۔ جیسے زمین پھٹ گئی ہے ان کے چہرے قریب قریب زرد پڑ گئے۔ اور نزہت تو اپنی جگہ سے یوں اچھلی جیسے یہ موٹر کسی غنیم کی تھی، موٹر میں سے پہلے منّو اترا اور پھر زمرد بیگم، زمرد بیگم اس وقت، ہلکے بادامی رنگ کی زردار ساڑھی پہنے تھی۔ اس کا روپ، کچھ عجیب طرح نکھر گیا تھا۔ یہ تو بالکل کوئی انتہائی خوبصورت، انتہائی حسین، انتہائی مغرور رانی معلوم ہوتی تھی۔ دونوں رانیاں اسے کوئی اپنی قسم کی رانی سمجھیں، اور ان کے غصّہ نے حیرت کی شکل اختیار کر لی وہ سوچنے لگیں۔ ان لوگوں نے منّو کو ایسے ہی بدنام کر دیا، یہ تو ایک اونچے درجہ کی رانی کسی بڑے شاہی خاندان کی بیٹی، اپنے ساتھ لایا ہے۔

ابھی وہ پوری بات سوچ نہ پائی تھیں، دیوانی نزہت نے مسکراتے منّو کے گریبان میں دونوں ہاتھ ڈال دئیے اور بڑی سختی سے گھسیٹتی ہوئی، ان سب کے سامنے لے آئی۔

منّو ابھی تک ہنس رہا تھا، اسکے ہونٹوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ غائب نہ

ہوئی تھی اسکی اس مسکراہٹ سے نزہت کا غصہ اور بڑھا۔ اور وہ بہت زور سے گرجی،

ایک تو جرم کیا، ایک تو انتہائی آوارہ اور پست درجہ کی لڑکی کو پسند کر کے ہم

سب کی توہین کی اور دوسرے یوں ہنس رہے ہو جیسے۔

ابھی اس نے اپنی بات پوری نہ کی تھی۔ کہ منّو کے چہرے کا رنگ اچانک بدل

گیا، اور اس نے خود کو نزہت کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے اسے ڈانٹا،

نزو اگر تمہاری جگہ کوئی دوسرا ایسی بات مجھ سے کہتا تو خدا جانتا ہے۔ میں اسے

اسیوقت گولی مار دیتا۔ تم نے میری نہیں اس عورت کی توہین کی ہے۔ جو فرشتوں کے

ہم پلہ اور حوروں کی ہم سر ہے۔

نزہت چلائی۔

مجھے۔ اپنی بات پر اب بھی اصرار ہے۔ میں جانتی ہوں، کہ جس لڑکی کو تم

حوروں کا ہم سر کہہ رہے ہو۔ اس کے محلے میں، کوئی شریف عورت اس سے

بات کرنے پر تیار نہ تھی۔ محلہ بھر کی عورتیں اس کی بد کرداری کے سبب اس کے

منہ پر تھوکتی تھیں۔ اور دودھ بیچنے اور سبزی کا کاروبار کرنے والے لوگ۔ اسے

اپنی بہو بنانے پر آمادہ نہ تھے۔

کرنل صاحب نے تائید کی۔

ہاں، منّو، نزہت ٹھیک کہتی ہے۔ خود میں نے اس محلہ کے چودھریوں

سے اس لڑکی کی ساری روئداد معلوم کی ہے۔

منّو کی ماں کے بھی خاندانی خون نے جوش کیا۔

منّو تم نے اپنی اس حرکت سے سارے خاندان کی ناک کاٹ دی ہے۔

تم نے ہمیں کہیں مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا!

اور میں تمہیں کبھی اس بات کی اجازت نہیں دوں گی کہ تم اس قسم کی آوارہ لڑکی کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہو۔

ماں کی آواز کسی قدر بھرا گئی!

تم نے خاندان کی روایت ہی نہیں توڑی، تم نے قرآن حکیم کی بے حرمتی کی ہے تم نے قرآن کو بیچ میں رکھ کر میرے ساتھ اقرار کیا تھا کہ تم کسی ایسی لڑکی سے بیاہ نہیں کرو گے۔ جسے میں پسند نہ کروں۔

منّو چیخا۔

امّی! میں نے یہ اقرار اس وقت کیا تھا جب میرے ذہن کی آنکھیں ابھی کھلی نہ تھیں۔ جب مجھے بُرے بھلے کی تمیز نہ تھی۔

خالہ نے بھی حصّہ لیا۔

جی ہاں تمہارے ذہن کی آنکھیں تو اب کھلی ہیں، جب اس آوارہ عورت نے تم پر جادو کر دیا ہے۔

منّو نے احتجاج کیا۔

خالہ، تم مجھے جو چاہو کہہ لو۔ مگر اسے کچھ نہ کہو، تم کیا جانو، وہ کتنی اونچی اور کتنی بڑی عورت ہے۔

اس مادرِ گیتی نے ایسی اونچی عورت آج تک نہیں جنی۔

ماں چلّائی۔

جی! تم جوان ہو گئے ہو نا، اس لئے اب، نہ تمہاری ماں اونچی عورت

ہے، نہ تمہاری ماں اور باپ اور تمہارے بزرگوں کو جننے والی عورتیں ہی بزرگ رہیں۔

ماں کی آواز بہت زیادہ بلند ہو گئی!

جی تم نے ایسی بزرگ عورت پالی! تو خبردار جو اس گھڑی کے بعد، تم اس عورت کے ساتھ، یا اس عورت کے بغیر میری دہلیز پر آئے۔

میں نے تم سے اس دن سے اپنا ہر رشتہ توڑ لیا۔

یاد رکھو!

میرا خون ایک بڑے آدمی کا خون ہے۔ میری رگوں میں اس آدمی کی غیرت رواں ہے جس نے سر کٹا دیا مگر آن پر حرف نہ آنے دیا۔

کرنل صاحب کو اپنے یہ اونچے باپ، یہ بات کے ذہنی تعلق دار یاد آ گئے اور انہوں نے پورے جوش کے ساتھ بہن کی تائید کی۔

منتو! ہمارا خاندان اپنی روایات کو کبھی نہیں بھولا، اور نہ کبھی بھولے گا۔ ہم اپنی آن پر سر کٹا دیتے رہے ہیں۔ ہمیں آن کے مقابلہ میں نہ اولاد عزیز ہے اور نہ کوئی اور رشتہ! تمہاری ماں نے جو کہا وہی ہو گا!

البتہ میری طرف سے تمہیں مہلت دی جاتی ہے کہ اگر تم اسی وقت اپنی ماں، اپنی خالہ، اور نزہت سے اپنے اس قصور پر معافی چاہ لو، اگر اقرار کرو کہ تم اس زمرد بیگم سے کبھی نہ ملو گے، اگر تم معاہدہ کرو کہ تم نزہت جہاں کو اپنی دلہن بناؤ گے تو یہ آپا اور نزہت تمہارا قصور معاف کر دیں گی۔

اس وقت جب کرنل صاحب نے آخری بات کہی زمرد بیگم بھاگی بھاگی ان کے

پاس آئی اور ان سب کے سامنے رکوع کے بل جھک کر روتی ہوئی آوازمیں کہنے لگی۔
میں میجر صاحب کی طرف سے یہ اقرار کرتی ہوں۔

میجر نے دفعتاً، اپنی کمر میں لٹکے ہوئے ریوالور پہ ہاتھ مارا، اور اسے نوچتے ہوئے اس کی نلی زمرد بیگم کی طرف کرتے ہوئے گرجا!

خبردار جو تم نے ایک لفظ اور بھی آگے کہا۔ یہ میری خاندانی آن کا سوال ہے۔
میرے خاندان کو اپنی آن عزیز ہے۔ اپنا خون پیارا ہے۔ مجھے بھی اپنی آن، اپنا عہد اور اپنا انتخاب عزیز ہے۔

میں نے تمہیں اپنے لئے چن لیا ہے۔ میں نے تمہیں اپنانے کا عہد کر لیا ہے اور یہ عہد پورا ہو گا۔ دنیا کی ہر قوت کی مخالفت کے باوجود پورا ہو گا۔

اس نے پستول کیا نکالا، منظر ہی بدل گیا۔ اونچے خون پر فخر کرنے والی رانیاں بید مجنوں کی طرح کانپنے لگیں۔ اگر کوئی نہیں کانپا، تو کرنیل صاحب اور نزہت تھے۔ کرنیل صاحب کے چہرہ پر، تو ایک عجیب کیفیت جھلک آئی تھی۔ ایسی کیفیت جس کو سمجھنا آسان نہ تھا۔ البتہ نزہت، غصہ سے آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ زمرد کے بالوں میں اُلجھا دیئے تھے اور اسے اس طرح گھسیٹنے لگی تھی جیسے وہ کوئی بہت ہی حقیر مجرم تھی۔ اور میجر کے لئے اسے دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کی نلی دب گئی تھی، دھوئیں کی چادر سی پھیل نکلی تھی۔ اور دھوئیں کی اس چادر میں لپٹے، میجر منّو نے زمرد کو اپنی گود میں بھرا، اور اپنی موٹر کی طرف اس تیزی سے بڑھا جیسے وہ غنیم کے نرغے سے اپنے کسی مجروح ساتھی کو اُٹھا کر فرار اختیار کر رہا تھا۔

سارے مجمع پر حیرت، کپکپی، اور غصہ مسلط تھا۔ کرنل صاحب، زخمی نزہت کو گود میں لئے زمین پر بیٹھے تھے۔ رانیاں، زمین پر گرتی ہوئی کانپ رہی تھیں۔ نوکروں کی پلٹن کی پلٹن نے میجر کی موٹر کے سامنے باڑھ باندھ دی تھی۔ میجر نے اس ماحول کے باوجود نہ مرد کو بڑے اطمینان کے ساتھ موٹر میں ڈالا، خود موٹر میں بیٹھا۔ موٹر اسٹارٹ کی، ایک ہاتھ سے ہینڈل سنبھالا اور دوسرے ہاتھ میں ریوالور پکڑے ہوئے سامنے کی طرف رُخ کر کے کئی ہوائی فائر کئے اور چلایا۔

جان چاہتے ہو تو راہ دے دو۔

ورنہ ....

وہ سب، جان چاہتے تھے، انہوں نے راہ دے دی۔ اور میجر کی موٹر، اس تیزی کے ساتھ آگے بڑھی جیسے وہ موٹر نہیں آرمرڈ کار تھی۔

کرنل صاحب کو آن بڑی عزیز تھی۔ انہیں خاندان کے وقار سے بے حد عشق تھا، انہوں نے نزہت کو گود میں سے اتارتے ہوئے۔ ہانک لگائی۔

ڈرائیور ہماری موٹر نکالو، ہم اس کا تعاقب کریں گے۔

مگر زخمی نزہت نے کرنل صاحب کے پاؤں پکڑ۔ ان پر رکھتے ہوئے التجا کی۔

نہیں کرنل صاحب، اس کا تعاقب نہیں ہوگا۔ تو یہ گی۔ تو یہ کوئی جان سکے گا۔ کہ یہاں کیا حادثہ ہوا۔

کرنل صاحب نے ان سنی کر کے پاؤں کو چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن نزہت ان سے اس طرح لپٹ گئی تھی کہ کرنل صاحب جہاں کھڑے بیٹھ گئے۔

ان کا غصہ دھیما پڑ چکا تھا۔ انہوں نے نزہت کا سر پھر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کی آنکھوں، اس کی پیشانی، اور سر کو اس طرح چومنے لگے جیسے یہ نزہت ان کی صلب سے پیدا ہوئی تھی۔ جیسے یہ ان کی اپنی بیٹی تھی۔ اور وہ دونوں رانیاں جو ابھی تک کانپ رہی تھیں ہوتے ہوئے زمین پہ گھسٹتی، نزہت کے قریب آگئیں اور اس کے پاؤں کو لپٹ گئیں۔

نزہت کے زخمی بازو سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ اس کی ساڑھی لہو لہان ہو گئی تھی۔ دفعتاً کرنیل صاحب نے اس کے سر کو چھوڑ دیا۔ اور بازو پہ دباؤ کی۔ حواس کسی قدر ٹھکانے لگ گئے تھے اور ان کی ڈاکٹری کی حس بیدار ہو گئی تھی کہ انہوں نے پیچھے کی طرف منہ کر کے نوکروں کو پکارا۔

ارے کوئی میرا اٹیچی کیس جلدی لاؤ۔

نوکر ابھی تک سہمے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے ادھر ادھر دیکھا اور منو کا نام و نشان کہیں نہ پا کر کرنیل صاحب کے کمرے کی طرف بھاگا۔

رانی شمیم پور نزہت کے ایک پاؤں سے لپٹی زار و قطار رو رہی تھی۔ اور رانی مہدی پور بھیا سے قریب قریب سسکتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

بھیا کیا یہ بچ جائے گی۔ کیا منو پر قتل کا مقدمہ چلے گا۔ اسے پھانسی نہیں ملے گی۔ بھیا کو کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ وہ نزہت کے زخمی بازو کو جس میں گولی آر پار ہو گئی تھی۔ ایک بدحواس باپ کی طرح تھامے تھے۔ ان کی آنکھیں بہ رہی تھیں اور وہ کھوئے کھوئے دماغ کے ساتھ سوچ رہے تھے۔

نزہت کو اگر کچھ ہوا، اگر یہ زندہ نہ رہی، تو منو کو میں اپنے ہاتھ سے

قتل کر دوں گا۔

رانی مہدی پور نے کانپتی ہوئی آواز کے ساتھ اپنا سوال دُہرایا۔ تو بھائی کی جگہ نزہت نے انتہائی پست آواز میں جواب دیا۔

نہیں! منّو کو کچھ نہیں ہوگا۔ منّو کو دنیا کی کوئی قوت پھانسی نہ دے سکے گی۔

میں دنیا بھر سے کہوں گی۔ مجھے منّو نے گولی نہیں ماری ہے میں نے آپ زبردستی منّو کے ہاتھ سے پستول چھین کر آپ اپنے آپ کو زخمی کیا ہے۔

کرنیل صاحب ایک بار پھر اندھی محبت کرنے والے باپ بن گئے۔ وہ اس نزہت کی آنکھوں، پیشانی اور مانگ کو دیوانہ وار چومنے لگے۔

نوکران کا اٹیچی کیس لے آیا۔ تو وہ دفعتاً اپنی دیوانگی سے جاگے۔ اب وہ ہوشمند اور فرض شناس ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے نزہت کے بازو کی پٹی اس ہنرمندی اور چابکدستی سے کی۔ جس کا مظاہرہ انہوں نے جنگِ عظیم کے آخری سالوں میں کیا تھا اور ہزاروں زخمی سپاہیوں کو از سرِ نو زندگی بخشی تھی۔ مرہم پٹی کرتے ہی انہوں نے بے ہوش نزہت کو گود میں بھرا۔ اور بڑی احتیاط سے قدم اُٹھاتے برآمدے تک آئے، نوکروں کو اشارہ کیا کہ بیڈروم کا دروازہ کھولیں دروازہ کھلا تو وہ نزہت کو لے کر اندر بڑھے اور اپنے بستر پر ڈال دیا۔

نزہت نقاہت کے سبب، حواس میں نہ تھی۔ اور کرنیل صاحب، نہ جانے پھر حواس کھو گئے تھے۔ کہ کمرے میں دیوانہ وار ٹہلنے لگے۔ اور پھر ایک دم ساتھ کے کمرے میں گھس گئے۔ اپنا ریوالور نکالا، اس میں گولیاں بھریں۔ اور باہر کو لپکے باہر رانی فہیم پور، اپنی دو ماماؤں کا سہارا لئے برآمدہ کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

بھائی کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر کانپنے لگی۔ اور کانپتے کانپتے عین اس وقت جب بھائی نے ساتھ سے گزر جانا چاہا۔ وہ ان کے پاؤں پہ گر گئی اس کی ماتا کا خون جوش کھانے لگا تھا وہ بھائی کے بوٹوں پر اپنی آنکھیں، اپنا چہرہ اور پیشانی رگڑ رہی تھی۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ صرف اپنا عمل جاری رکھا۔ بھائی کے عزم نے ایک بار پھر شکست مان لی، وہ ہولے سے نیچے کو جھکے۔ اور پستول پرے رکھ کر بہن کا سر اپنی چھاتی پر رکھ دیا۔ اور آپ بھی رونے لگے۔

ادھر رانی ہمدری پورا اپنا فرض پورا کر رہی تھی۔ اس نے برآمدے کے دوسرے کونے میں نوکروں، ماماؤں اور خدمت پیشہ لوگوں کو جمع کر رکھا تھا۔ اور ان سے ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔

گولی منّو نے نہیں۔ نزہت نے خود چلائی تھی، اس نے میرے سامنے، منّو کے ہاتھ سے پستول چھینا اور ہم سب کے دیکھتے دیکھتے۔ اپنے آپکو زخمی کر لیا۔

نوکر اور مامائیں حیرت و استعجاب کے ساتھ یہ بیان سن رہی تھیں۔ ان میں سے کتنوں نے خود اپنی آنکھوں سے منّو کو فائر کرتے دیکھا تھا۔ اس منّو نے خود ان پر شست باندھ کر کتنے ہوائی فائر کئے تھے۔ اور چھوٹی بیگم صاحبہ ان سب کو جھٹلانے کے لئے یہ بیان دے رہی تھیں۔ ان کا بیان ابھی تک جاری تھا۔

خبردار تم میں سے اگر کسی نے، کوئی جھوٹی بات باہر جا کر کہی۔ اگر کسی نے اپنی طرف سے منّو پر جھوٹا الزام لگایا۔

پھر ان سب کو اشارہ سے اپنے پیچھے آنے کا حکم دے کر بڑے کمرے میں

گھس گئیں۔ حیران، اور سہمے سہمے نوکروں اور ماماؤں نے تعاقب کیا۔ اور چھوٹی رانی جی نے، اپنے منی بیگ میں سے، سوسو کے کوئی بیس نوٹ، اکٹھے نکال کر ان میں پھینک دیئے۔ اور حکم دیا۔

تم میں سے ہر ایک، ایک نوٹ اٹھا لے۔

اور ذرا رک کر مزید لالچ دیا۔

ابھی آپا آئیں گی، تو تم سب کو دو دو نوٹ اور ملیں گے۔

سمجھ گئے؛

حیران اور سہمے سہمے خدمت پیشہ لوگوں کے چہرے چمک اٹھے تھے یہ کوئی معمولی انعام نہ تھا، کوئی معمولی رقم نہ تھی جو انہیں ملی تھی۔ ان میں سے، ہر ایک کے ہاتھ میں سو کا نوٹ تھا، اور ایسے ہی دو، اور نوٹ، ذرا ٹھہر کر ملنے والے تھے۔

ان میں سے کئی کا جی چاہا، ایسی گولیاں روز چلیں اور ان پر اسی طرح نوٹوں کی بارش ہو۔

جو خادمائیں شمیم پور اور مہدی پور سے آئیں تھیں۔ وہ حق نمک ادا کرنے میں بڑی مہارت رکھتی تھیں۔ چھوٹی رانی جی کے باہر جاتے ہی۔ وہ رانی جی کے قصیدے پڑھنے لگی تھیں۔ اور ان میں سے کئی خدا، رسول، قرآن پاک اور اماموں کی قسمیں کھا کھا کر کہہ رہی تھیں۔

ہم نے آپ دیکھا۔ حضرت بی بی نے اپنے آپ گولی ماری۔ آپ شہزادے صاحب کے ہاتھ سے ریوالور چھینا۔

یہ کتنا سفید جھوٹ تھا جو یہ ماماِئیں بول رہی تھیں۔ خادم مردوں نے جنکی

تعداد چھ سے بھی زائد تھی، میجر صاحب کے ہاتھ میں پھٹ پھٹ کرتا دھوئیں چھوڑتا پستول اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن ان کے ہاتھوں میں ایک ایک سو روپے کا نوٹ ابھی تک پہنچا تھا۔ روپیہ اس دنیا میں بڑی چیز ہے سب سے بڑی سچائی اور سب سے بڑی صداقت ہے۔ وہ سر دل کو جھکائے، کمرے سے باہر نکلے اور اپنے اپنے کام میں لگ گئے لیکن ابھی تک ان کے ذہنوں پر اس حادثہ کی ہولناکی مسلط تھی۔ دفعتاً باہر سے پھر پے در پے کئی فائر ہونے کی آواز آئی۔ وہ پھر کانپ گئے، اور سہمے سہمے دماغوں کے ساتھ باہر کو لپکے ابھی برآمدہ میں پہنچ آئے تھے کہ انہوں نے باہر لان میں ایک حسرت بھرا منظر دیکھا کرنل صاحب کے دو سب سے بڑے کتے زمین پر پڑے تڑپ رہے تھے ان کے جسم سے بہنے والے خون نے کتنے پھیلاؤ میں زمین رنگ دی تھی۔ اور کرنل صاحب ریوالور ہاتھ میں پکڑے ان کے تھوڑے فاصلے پر اس طرح کھڑے تھے جیسے وہ کتوں کے ڈاکٹر تھے۔ اور کتوں کو متعدی بیماری میں مبتلا پا کر، یہ حرکت فرمائی تھی۔

نوکروں کی سمجھ چھوٹی تھی۔ وہ بے چارے سوچنے لگے۔

کرنیل صاحب نے اتنے قیمتی تومند اور نفیس کتوں کو اس طرح اچانک کیوں مار ڈالا۔!

یہ تو کرنیل صاحب ہی جانتے تھے کہ ان کی اس حرکت کا باعث کیا حکمت تھی۔ نوکر بے چاروں کو اس حکمت کا پتہ تو اس وقت چلا، جب تھوڑی دیر بعد تین دو پولیس کے سپاہی، اور ساتھ کی کوٹھیوں کے صاحب لوگ ادھر کو لپکے بڑھے آئے۔

کرنیل صاحب نے مسکرا مسکرا کر ان کا استقبال کیا۔ وہ سب اس جگہ آن جمع ہوئے تھے جہاں کتے گھرے پڑے تھے اور زمین انکے خون سے لالہ زار بنی تھی۔

کرنیل صاحب نے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، اپنی بھاری بھرکم آواز میں اپنے اس فعل کی تشریح کی۔

یہ میرے کتے مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز تھے۔ مگر انھیں اچانک رات ایک ایسی بیماری لاحق ہو گئی تھی، جو حد سے زیادہ متعدی اور انتہائی خوفناک تھی اور میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں انہیں آپ اپنے ہاتھ سے گولی مار دوں!

پھر ان کتوں کی تعریف، ان کی نسل، ان کی افادیت کے قصے مزے لے لے کر ان سے کہے، ان کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ اور ایک آنکھ سے توپے درپے کئی آنسو چھلک کر ان کے بوڑھے چہرہ پر ڈھلک آئے۔

سنتری لیے چار سے حیران حیران دماغوں کے ساتھ، اپنی راہ لگ گئے۔ ساتھ کی کوٹھیوں کے صاحب لوگ اور نوکر لوگ بھی، ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ اور کرنیل صاحب نے وہیں کھڑے کھڑے نوکروں کو حکم دیا۔

کتوں کی نعشوں کو ٹرک میں لاد کر جنگل میں پھینک آؤ۔ اور مالیوں کو ارشاد فرمایا یہ جگہ دھو دیں۔

یہ فرض انجام دینے کے بعد وہ جب نزہت کے کمرے میں آئے تو نزہت ہوش میں آ چکی تھی اور اپنے قریب کھڑی ... سے پوچھ رہی تھی۔

یہ نامعلوم کیسے ہو گئے تھے، کیا ... پھر آ گیا تھا۔ کیا اسنے پھر کسی کو زخمی کیا۔

رائیوں میں سے کسی نے بھی اس نزہت کے استفسار کا جواب نہ دیا، کرنیل صاحب اندر آئے تو نزہت نے یہی بات ان سے پوچھی، وہ اس کے سر کے قریب زمین پر دوزانو بیٹھ گئے اور اس کا سرا پنے دونوں ہاتھوں میں لے کر مری مری آواز میں سرگوشی کی۔

بیٹی تم نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں کوئی ایسی ترکیب کروں کہ یہ بات چھپ جائے اور کوئی یہ جان نہ سکے کہ منّو نے کیا حرکت کی۔ میں نے میری جان اپنے دو بہترین کتے۔ لان پر روک کر، اپنے ریوالور سے مار دیئے ہیں۔ میں نے ان پر بارہ گولیاں چلائی ہیں، خوب دھواں اُڑایا ہے۔ خوب ٹھاٹھا کی ہے۔

اور اب منّو پر کوئی شبہ نہ کر سکے گا، کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکے گا۔ کہ منّو یہاں آیا بھی تھا یا نہیں۔ اور اگر آیا تھا تو اس نے کیا بُری حرکت کی تھی۔

نزہت نے کرنیل صاحب کے وہ دونوں ہاتھ دفعتاً چوم لیے جو اس کے چہرے کا طواف کر رہے تھے اور اپنی لانبی لانبی مستی بھری آنکھیں ان ہاتھوں پر اس طرح رگڑنے لگی جیسے کرنیل صاحب نے اس کی ساتوں پشتوں پر لاکھوں احسانات ایک ساتھ کر دیئے تھے۔

ان کے ہاتھوں پر آنکھیں رگڑتے رگڑتے وہ نقاہت کے سبب پھر بیہوش ہوگئی۔ اور کرنیل صاحب نے دونوں بہنوں کو اشارہ کیا، اس جگہ سے باہر چلی جائیں۔ وہ ان کے جاتے ہی، ٹیلیفون کے قریب آئے۔ اور لفٹنٹ کرنیل ڈاکٹر رحیم یار خاں سول سرجن اور ٹنگ ہسپتال کا نمبر ملاتے ہوئے، ان سے کہنے لگے۔

ڈاکٹر بھئی! تم آپ، ہسپتال کی ایک ایمبولینس کار ڈرائیو کرتے ابھی میرے

پاس آؤ، ایک بہت نازک سا کیس ہے۔ لیکن خبردار کسی کو معلوم نہ ہو کہ بات کیا ہے!

ڈاکٹر لفٹننٹ کرنیل رحیم یار خاں، کرنیل صاحب کے پرانے ساتھیوں اور ایک طرح کے شاگردوں میں سے تھے۔ ڈاکٹر صاحب جس وقت لفٹننٹ کرنیل تھے اس وقت رحیم یار خاں نے فوج میں کمیشن لیا تھا۔ اور کئی سال ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں سپاہیوں کے زخم سیئے تھے۔

کرنیل صاحب کا حکم اب بھی ان کے لئے حکم تھا۔ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ دفتر سے اُٹھے، ہسپتال کے موٹر گیراج میں آئے۔ ایک ایمبولینس کار میں بیٹھے اُسے باہر نکالا، اور ہسپتال کی ایک بہت ہی معتمد میٹرن کو ساتھ بٹھا کر، اکبر روڈ کا رخ کیا۔ جب ان کی ایمبولینس کار نوازولا میں داخل ہوئی تو کرنیل صاحب، بڑی بے تابی کے ساتھ گیرٹ کے قریب ٹہل رہے تھے۔ لفٹننٹ کرنیل رحیم یار خاں کو ایمبولینس کار روک کر باہر نکلتے دیکھا، تو اُن سے لپٹ گئے۔ اور کچھ دیر ان سے سرگوشی کرنے کے بعد، پھر ایمبولینس کے قریب آئے۔ ان کی جگہ آپ ڈرائیور کی جگہ بیٹھے۔ اور ایمبولینس کار کو ڈرائیو کرتے برآمدے کے قریب پہنچے۔ اسے روکا، باہر کودے اور ڈاکٹر رحیم یار خاں اور میٹرن کو ساتھ لے کر بیڈ روم میں گھس گئے۔ نزہت ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ رضائی نے اس کا زرد زرد مگر انتہائی خوبصورت چہرہ چھپا رکھا تھا کرنیل صاحب نے اسے بڑی احتیاط کے ساتھ رضائی میں لپیٹ کر، اپنی گود میں اٹھایا۔ اور باہر تشریف لائے۔ اور ادھر اُدھر دیکھ کر، کرنیل رحیم یار خاں کو اشارہ کیا۔ پہلے وہ سوار ہوں تاکہ سہارا دے سکیں۔ دونوں نے مل کر، نزہت کو اندر پچھے ہوئے اسٹریچر پر لادا خود وہیں بیٹھے، اور رحیم یار خاں سے کہا ایمبولینس کار کو ہسپتال لے چلے۔

جب ایمبولینس کار واپس بھاگ رہی تھی کرنیل صاحب کی آنکھیں گنگا جیسی روانی سے بہ رہی تھیں وہ بار بار نزہت کے چہرے سے رضائی ہٹاتے اور اسکی زور زور پیشانی چوم لیتے۔

کار ہسپتال کے آپریشن تھیٹر کے سامنے پہنچ کر رکی۔ تو کرنیل صاحب نے اس عزیز بوجھ کو پھر گود میں لادا اور ڈاکٹر رحیم یار خاں سے کہا۔

آگے بڑھ کر یہ بوجھ اپنی گود میں لے لے۔

نیچے اتر کر انہوں نے یہ بوجھ پھر اپنی گود میں لیا اور آپریشن تھیٹر میں گھس گئے انہیں آپریشن کا کام چھوڑے تین سال ہو چکے تھے۔ یہ بات لفٹنٹ کرنیل رحیم یار خاں کو بھی معلوم تھی وہ سوچ رہے تھے۔ آج اپنے استاد کے سامنے آپریشن کریں گے مگر کرنیل صاحب نے نزہت کو اسٹریچر پر لٹا کر اپنا کوٹ پھینکا۔ آستینیں چڑھالیں تو لفٹنٹ کرنیل رحیم خاں کو ایسے لگا جیسے وہ نئے نئے بھرتی ہو کر اپنے استاد کی مدد کرنے آپریشن تھیٹر میں آئے ہیں، انہوں نے ایک ایک کر کے سارے اوزار انکے سامنے رکھ کر ٹرے میں ڈال دئے کرنیل صاحب نے میٹرن کی مدد کے بغیر نزہت کی پٹی کھولی نزہت ابھی تک بے ہوش پڑی تھی اور چہرے کی رنگت پہلے سے کہیں زیادہ زرد پڑ چکی تھی کرنیل صاحب نے پٹی کھول کر رحیم یار خاں کی مدد سے زخم دھویا۔ اور ان سے فارسی میں کہا۔

جلدی ہی میں میں زخم اچھی طرح دھو نہیں سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گولی کا زہر خون میں سرایت کرنے لگا ہے۔

کرنیل رحیم یار خاں تیزی سے سامنے کی الماری کی طرف لپکے، اور یہ دنیا کی ایک نئی تخلیق کا پیکٹ کرنیل صاحب کے سامنے کرتے ہوئے التجا کی۔

اجازت ہو، تو اس کی ایک پچکاری تیار کرلوں، یہ دوا اس سال کی ایجاد ہے۔اور اس قسم کے کیسوں میں بڑی آزمودہ ہے۔

کرنیل صاحب نے پچکاری بھرنے کی اجازت دی، جب پچکاری بھر چکی" تو آپ اپنے ہاتھ سے نزہت کے مونڈھے کے قریب انجکشن دیا۔

زخم کو ایک بار پھر، ایک اس سلوشن سے دھویا گیا جو رحیم یار خاں نے تجویز کیا تھا۔ پٹی پھر بندھی۔

کرنیل صاحب نے اس کام سے فراغت پاکر میٹرن کی طرف دیکھا۔ میٹرن سے کسی بات میں بھی مدد نہیں لی گئی تھی۔ میٹرن کو دیکھ کر کرنیل صاحب کو دفعتاً کوئی احساس ہوا جیب میں ہاتھ ڈال کر چیک بک نکالی۔ اور ابھی فونٹن پن سے وہ چیک کی خانہ پری نہ کر پائے تھے کہ ڈاکٹر رحیم یار خاں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور فارسی ہی میں پوچھا۔

یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟

کرنیل صاحب نے میٹرن کی طرف دیکھا۔ رحیم یار خاں نے اطمینان دلایا۔

یہ میری سب سے زیادہ معتمد میٹرن ہے۔ اس پر مجھے ویسا ہی اعتماد ہے جیسے آپ کو مجھ پر ہے۔

پھر بھی کرنیل صاحب نہیں مانے۔ اور ایک ہزار روپے کا ایک چیک کاٹ کر میٹرن کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میٹرن نے لفٹنٹ کرنیل صاحب کی طرف دیکھا ان کا سر جھکا تھا۔ میٹرن کا ہاتھ چیک کی طرف بڑھ گیا اور وہ سر جھکا کر باہر نکل گئی۔ اسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا۔ اس کا ذہن عجیب قسم کے گورکھ دھندے میں الجھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہیں یہ لڑکی کرنیل صاحب کے ہاتھ سے تو زخمی نہیں ہوئی۔ یا کوئی اور بات تو نہیں ہوگئی۔

کرنل صاحب آپریشن تھیٹر میں کھڑے اپنے شاگرد کے کان میں ہولے ہولے یہی بات کہہ رہے تھے، انہوں نے اپنے اس شاگرد سے جوان کے بہت سے جوانی کے رازوں میں شریک تھا۔ اپنے خاندان کا یہ راز بھی کہہ دیا تھا۔ لفٹننٹ کرنل رحیم یار خاں کے لئے یہ راز کچھ زیادہ اہم نہ تھا انہوں نے بھی اپنی جوانی میں ایسی ہی ایک حرکت کی تھی۔ اور گرفتاری سے بچنے کے لئے، پریکٹس چھوڑ کر فوج میں شرکت کر لی تھی۔ انہوں نے کرنل صاحب کو تسلی دی اور اس لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا جو ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ وہ کرنل صاحب کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے الماری کی طرف بڑھے ایک اور پیکٹ اٹھایا۔ جلدی سے اسے کھولا، ایک اور پچکاری بھری، اور کرنل صاحب کے استفسار کے باوجود، مریض کے دوسرے بازو میں ایک اور انجکشن لگا دیا پھر پاس کھڑے ہو کر، اس انجکشن کا اثر دیکھنے لگے۔ ابھی انجکشن لگائے پورے دو منٹ بھی نہ ہو پائے تھے کہ نزہت نے آنکھیں کھول دیں۔ اور چاروں طرف دیکھا۔ بڑے کرنل صاحب کو دیکھ کر مسکرائی اور چھوٹے کرنل کو سر کے اشارے سے سلام کیا۔ اور پھر نہ جانے کیسے کرنل صاحب سے پوچھا۔

ماموں جان! منو۔

کرنل صاحب کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور انہوں نے نزہت کا ایک ہاتھ اپنے سینہ پر رکھتے ہوئے اس سے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

میری بچی اب وہ کبھی یہاں نہ آ سکے گا۔ میں نے قسم کھائی ہے اگر وہ کبھی میرے سامنے آیا۔ تو میں اسے گولی مار دوں گا۔ اس نے میرے اس دوست کی بچی پر فائر کیا ہے جسے میں نے ہمیشہ اپنے آپ سے عزیز جانا!

وہ ذرا اُٹھ کے اور بڑی بے تابی کے ساتھ نزہت کی پیشانی چوم لی، ان کی آنکھوں میں چھلکنے والے آنسو، ان کے گالوں پر سے لڑھکتے نزہت کے اس ہاتھ پر آن گرے جو پٹی پر رکھا تھا۔ نزہت کا جی چاہا کرنیل صاحب سے کہے۔

ماموں میاں، یہ آنسو بہانے اور پریشان ہونے کی بات نہیں۔ میں نے تو منو کی دوستی کا حق ادا کیا ہے منو میرا ویسا ہی دوست تھا جیسے میرے باوا آپکے دوست تھے

مگر درد کی ایک خوفناک لہر اچانک اس کے زخم میں لہرا گئی۔ اور اس کا سارا جسم اس طرح کانپ گیا جیسے اس پر جان کنی کی تکلیف مسلط ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ چونے کی طرح سفید پڑ گیا تھا، کرنیل صاحب کو ایسے لگا جیسے اُن کا دل آپ ڈوب چلا ہے۔ لیکن چھوٹے کرنیل نے ایک اطمینان کا سانس لیا۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ اسٹریچر کے قریب آئے۔ اور اپنی ہتھیلی پر رکھے ہوئے ایک چمچہ بھر سفوف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نزہت سے کہا۔

بیٹی یہ سفوف پھانک لو، ابھی ابھی طبیعت سنبھل جائے گی۔

نزہت نے یہ سفوف پھانک لیا۔ یوں بھی درد کی لہر امحض لہراتی تھی، بجلی کے کرنٹ کی طرح لہرا کر گزر گئی تھی۔ اس میں قرار نہ تھا سفوف نے معجزے کا سا کام کیا۔ اور نزہت کے چہرے کی سفید رنگت قدرے زردی مائل ہو گئی۔ بڑے کرنیل صاحب نے رحیم یار خاں کا ہاتھ چوم لیا اور تعریف کی۔

ماشاء اللہ، تم تو مسیحائی دکھا رہے ہو۔

رحیم یار خاں تسلیمات بجا لائے۔

اگر نامناسب نہ سمجھیں، تو بجم سے کہہ دیں یہاں آجائے۔

اگر نامناسب نہ سمجھیں، تو بیگم سے کہہ دیں یہاں آجائے۔

کرنیل صاحب ٹیلیفون پر گئے۔ اور بیگم کو نزہت کی خواہش سے آگاہ کر دیا۔ لوٹ کر آئے تو رحیم یار خاں نزہت کے اسٹریچر پر جھکے اس سے کہہ رہے تھے۔

میری جوانی میں بھی مجھے ایک ایسا ہی حادثہ ہو گیا تھا۔ میں نے بھی یہی حرکت کی تھی جو میجر منّو نے کی ہے۔

مگر میں نے عورت پر فائر کرنے کی بجائے مرد پر فائر کیا تھا۔ اور یہ مرد میرا اپنا بھائی تھا جس نے میری محبوبہ کو ایک غلیظ گالی دی تھی۔

کرنیل صاحب نے آخری لفظ سن کر پوچھا۔

یہ کس نے گالی دی تھی آپ کی محبوبہ کو۔

لفٹنٹ کرنیل صاحب شرما گئے جواب دیا۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے جس نے گالی دی تھی۔

کرنیل صاحب مسکرائے۔

ارے یہ تم نے نزہت سے کہہ دیا۔ بڑے بے وقوف ہو۔ بڑھاپے میں پہنچ کر بھی تمہیں عقل نہ آئی۔

چھوٹے کرنیل صاحب شرما گئے۔ کوئی تاویل نہ کر پائے تھے کہ سیسٹر نے اندر قدم رکھا اور اطلاع دی۔

آپ کے دفتر سے ملحقہ کمرہ میں بستر بچھا دیا گیا ہے۔ اگر حکم دیں تو اسٹریچر وہاں لے چلیں۔

کرنیل صاحب آگے بڑھے۔ لحاف سے نزہت کا چہرہ ڈھانپا۔ اور اسے

لے جانے کی اجازت دی۔ چھوٹے کرنیل صاحب ساتھ ساتھ چلے۔ البتہ بڑے
کرنیل صاحب کچھ دیر کے لیے وہیں رکے رہے۔

چھوٹے کرنیل صاحب کے دفتر کے ساتھ ان کی ایک مختصر سی آرام گاہ تھی جہاں وہ بڑے آپریشنوں سے فراغت پانے کے بعد آرام فرمایا کرتے تھے یہیں نزہت کا اسٹریچر لایا گیا۔ یہیں تھوڑی دیر کے بعد نجم بھی ایک مددگار کے ساتھ پہنچ گئی۔ نجم کی نگاہ جیسے ہی نزہت کے چہرہ پر اٹھی، وہ سر سے لے کر پاؤں تک کانپ گئی اور کانپتی کانپتی اس طرح نزہت کی پائنتی پر آن کھڑی ہوئی جیسے مجسمہ احتجاج تھی۔

مدد نزہت اسے دیکھ کر کسی قدر مسکرائی اور سر سے اشارہ کیا کہ قریب آئے۔ وہ اور قریب آئی۔ تو نزہت نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ کانپتی نجم نے یہ ہاتھ پکڑ کر اپنے سینہ پر رکھ لیا۔ اور کئی سال کی رفاقت کے بعد آج پہلی دفعہ وہ نزہت کے سامنے بچوں کی سی بے قراری کے ساتھ رو پڑی۔ اور سسکیاں بھرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ آپ کو اچانک کیا ہو گیا ہے؟"

نزہت مسکرائی، اپنے ہاتھ کی مدد سے اسے گریبان سے پکڑ کر نیچے کو جھکایا اور اس کے منہ کو اپنے منہ سے قریب کرتے ہوئے سرگوشی کی۔

نجم، میں ذرا اختر سے لڑ پڑی تھی، اس نے میرے بازو کو زخمی کر دیا مگر دیکھو یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔

اس کی آواز پہلے سے زیادہ صاف ہو گئی۔

تم گھر پر بڑی بی کو ٹیلیفون کر دو۔ میں آج کرنیل صاحب ہی کے ہاں رہوں گی

نجم کا جی چاہا نزہت سے کہے۔

یہ تو منّو نے بڑی بُری حرکت کی۔ یہ تو شریفانہ فعل نہ تھا۔

مگر وہ یہ بات زبان پر لا نہ سکی۔ اس کے حواس ابھی تک بجا نہ ہوئے تھے، کرنل صاحب کی راہنمائی سے وہ ٹیلیفون کے قریب آئی اور گھر ٹیلیفون کر دیا کرنل صاحب نے بھی اپنے نواز ولا کا نمبر ملایا اور بڑی رانی جی کو مشورہ دیا۔ یہاں تشریف لے آئیں۔

نجم لوٹ کر آئی۔ تو نزہت نے ایک بار پھر اس کا مُنہ اپنے مُنہ سے قریب کیا اور سرگوشی کی۔

نجم۔ منّو میرا ویسا ہی دوست تھا جیسے شمّو، تمہاری دوست ہے۔ اگر شمّو کبھی غلطی سے، تمہیں زخمی کر دے تو کیا تم اُسے معاف نہ کرو گی۔

نجم سوچ میں پڑ گئی، نزہت نے اپنا ہاتھ اُسکے سنہرے بالوں والے سر پہ رکھ دیا۔ اور بہت دھیمی آواز میں سلسلہ کلام جاری رکھا۔

لیکن نجم . . . . مجھے منّو سے ایک شکایت ہے، اس نے مجھے اس عورت کی خاطر مارا ہے۔ جو انتہائی آوارہ تھی جو اس قابل نہ تھی کہ منّو اس سے شادی کرتا۔

نجم نے کچھ کہنے کے لئے زبان کھولی!

سرکار۔ انہیں یہ جرأت کیسے ہوئی، کیا کسی نے انہیں ایسی بُری بات کرنے سے روکا نہیں تھا۔

نزہت نے نجم کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور نجم سوچنے لگی۔ سرکار کو اس منّو سے ویسی ہی محبت معلوم ہوتی ہے جیسے زہرہ کو کلیم سے تھی زہرہ اور کلیم! اسکے حافظہ کی تختی پر کیا اُبھرے۔ نجم، نزہت اور منّو کی بات ہی بھول گئی۔ یہ زہرہ اور کلیم تو اپنے وجود میں ہزاروں جہاں لئے ہوئے تھے۔ زہرہ نے اس کلیم سے کتنی ذلتیں

پائی تھیں۔ مگر پھر بھی جب کلیم پر مقدمہ چلا تو اس نے بھری عدالت میں کلیم کے حق میں شہادت دی اور اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کا کوئی خیال نہ کیا۔

نجم نے سوچا، کیا محبت میں یوں ہی ہوتا ہے۔ محبوب کی خاطر ہمیں اسی قسم کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ نجم کا جی چاہا۔ وہ بھی کسی سے ایسی محبت کرے جس میں اس قسم کی پریشانیاں، اٹھائے۔ یہ کیسی عجیب بات تھی جو اس نجم نے جو ہر لمحہ ہنستی، جو ہر آن قہقہے لگاتی، اس وقت چاہی۔

نزہت کا ایک ہاتھ اب تک اس نجم کے سر پر رکھا تھا وہ اب تک اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں الجھائے تھی، اور دونوں کرنل پاس کھڑے انہیں اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے یہ دونوں خوبصورت گڑیاں تھیں۔

دونوں رانیاں، اپنی داسیوں سمیت آن پہنچی۔ کرنل صاحب نے ان دونوں کو آگے بڑھنے نہ دیا۔ اور ان کو آنکھوں ہی آنکھوں میں ان دو جوان لڑکیوں کی باہمی محبت کا تماشہ کرنے کی دعوت دی۔ جن میں سے ایک مالکہ تھی اور ایک خادمہ، مگر جن کے انداز میں کسی قسم کا کوئی تفاوت نہ تھا۔

دونوں رانیاں، اس خوبصورت نجم سے ناآشنا تھیں، وہ اسے کوئی غیر لڑکی سمجھیں اور دل ہی دل میں ڈریں کہیں اس لڑکی کے ذریعہ۔ منو میاں کی بے ہودگی عام نہ ہو جائے۔ رانی شمیم پور ذرا زیادہ ڈرپوک تھیں، کرنل صاحب کا ہاتھ پکڑ کر انہیں ایک کونہ میں لے گئیں اور بہت دھیمی آواز میں پوچھا۔

کہیں نزہت نے اس لڑکی سے کوئی بات تو نہیں کہہ دی۔

کرنل صاحب نے رانی جی کا اندیشہ دور کرنے کے لئے نجم کا ہسٹری شیٹ

کھول دیا اور رانی جی مطمئن ہو گئیں، سوچنے لگیں۔

نزہت کا ذوق کتنا اونچا ہے۔ اس نے کتنی اچھی اور کیسی نستعلیق قسم کی لڑکی اپنی خدمت کے لیے چنی ہے۔

ان کا جی چاہا، کسی طرح ان دونوں کو اپنے ہاں لے جاسکیں۔

نجم نے ابھی تک ان دونوں کو نہیں دیکھا تھا۔ رانی جی کرنیل صاحب کے ساتھ ادھر آئیں تو نجم نزہت سے ہٹ کر رکوع کے بل جھک گئی، اور تسلیمات بجا لائی، اس وقت نہ جانے اس کے چہرہ پر ہی مسکراہٹ جھلک آئی تھی، جس کا اسے سروجاہت عالم مرحوم نے عادی بنا دیا تھا۔

دونوں رانیوں نے اس کی اس ادا کو بہت پسند کیا۔

اور نزہت کے سرہانے بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھتے ہوئے، نزہت کے انتخاب کی داد دی۔!

اس لڑکی نے نزہت کے چہرہ کی زردی اچک لی تھی۔ گو اس وقت اسکے چہرہ پر نقاہت کے آثار تو یقیناً تھے مگر پہلے جیسی زردی نہ تھی۔

حادثہ کے وقوع کے بعد پہلی بار دونوں نے، نزہت کے اس ابتلا پر اس سے ہمدردی کی، بڑی رانی جی نے کہا۔

نزہت بیگم، بڑی شرمندہ ہوں! کہ منو نے ......

وہ اس سے آگے ابھی کچھ کہہ نہ سکی تھیں۔ نزہت نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور التجا کی!

"منو کے متعلق، اور کچھ نہ کہیئے جو ہوا اچھا ہوا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو نہ جانے بات

کہاں تک بڑھ جاتی۔

سچ ہے، اگر منو یہ اقدام نہ کرتا تو نزہت اسکے خلاف ایک ایسا محاذ بناتی جس سے منو کی زندگی اجیرن ہو جاتی۔ مگر اس کی اس حرکت نے، اس جمات رندانہ یا دیوانگی نے نزہت کے ذہن کا رخ ہی پلٹ دیا تھا۔ اور وہ سوچنے لگی تھی۔

اچھا ہوا، منو نے یہ اقدام کر کے، اپنی راہ الگ کر لی چھ سال کی دوستی کا سلسلہ کاٹ دیا۔ ہر امید، ہر تعلق اور ہر قرب کو موت کی نیند سلا دیا۔

دونوں رانیاں، بات کے طول و عرض کے فلسفہ سے آگاہ تھیں۔ انہوں نے چند منٹ پہلے، جب نواز دلا سے چلی تھیں، آپس میں سمجھوتہ کر لیا تھا۔ کہ نزہت کو اپنا لیں گی۔ اور ہر قیمت پر اسے اپنے خاندان کی بہو بنائیں گی خواہ، اس کیلئے انہیں کوئی بہت بڑی قربانی کیوں نہ کرنی پڑے۔ نزہت کے اس جملہ نے، ان دونوں کے اس عزم کو اور پختہ کر دیا۔ اور انکا جی چاہا، اسی لمحہ نزہت سے کہہ دیں۔

نزہت بیگم۔ منو نے تم سے تعلق توڑ لیا ہے لیکن ہم یہ تعلق کبھی ٹوٹنے نہ دیں گی۔
ہم تمہیں اس خاندان کی بہو بنائیں گی جس کے ایک فرد نے تمہارے بازو کو اس بے دردی سے چھید ا۔

مگر نجم۔ اس کی ساتھی لڑکی، میٹرن، اور لفٹننٹ کرنل رحیم یار خاں کی موجودگی کے خیال سے انہوں نے اپنے دل کی یہ خواہش نزہت سے نہیں کہی۔ البتہ ان دونوں نے، نزہت سے اپنے دل کے تعلق کا اظہار کا موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ایک اس کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔ اور دوسری نے اس کے نازک نازک ہاتھ کو ملنا شروع کر دیا۔

اور نجم کا جی چاہا۔ وہ نزہت کے پاؤں سہلانے لگے۔

دونوں بوڑھے کرنیل ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دئے، کمرہ سے باہر نکل آئے وہ دونوں چپ تھے۔ انہوں نے کتنی دیر تک ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔ البتہ جب چھوٹے کرنیل نے اپنے ہاتھ میں بندھی گھڑی پر اچانک نگاہ ڈالی، تو گھبرائے گھبرائے بننے لگے۔

ارے۔ ایک منٹ کی تاخیر ہو گئی۔ مجھے نزہت بیگم کو دوسری خوراک ہ بیس منٹ بعد کھلا دینی چاہیئے تھی۔

یہ کہتے ہی، دوا خانہ کی طرف بھاگے۔ اور جب، دو منٹ بعد لوٹے تو ہانپ رہے تھے۔ انہوں نے کرنیل صاحب کا خیال کئے بغیر، نزہت کے کمرے میں قدم رکھا۔ اس وقت وہ پہلا ہی منظر چل رہا تھا۔ وہ ہانپتے ہانپتے نزہت کے بستر کے قریب آئے اور اس سے التجا کی۔

بیٹی، یہ سفوف، اور کھا لو، دماغ آرام محسوس کرے گا۔

نزہت نے منہ کھول دیا اور کرنیل صاحب نے سفوف کی پڑیا اس حسین دہانہ میں انڈیل دی، بڑھاپے کے باوجود، اس خوبصورت کھلے ہوئے دہانہ نے، ان کے جسم پر ایک عجیب کپکپی مسلط کر دی اور وہ سوچنے لگے۔

حسن بھی خدا کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ بھی کتنی بڑی دولت ہے، کتنا بڑا سرمایہ ہے، یہی احساس، ان پاس بیٹھی رانیوں کو بھی ہوا۔ وہ یقیناً آپ بھی اپنی جوانی میں ہزاروں لاکھوں میں ممتاز تھیں۔ لیکن اس نزہت جہاں بیگم کی تو بات ہی اور تھی۔ اور اس ہلکی ہلکی زردی اور نقاہت نے جو اسکے چہرہ پر چھائی تھی اس فتنہ کو قیامت بنا دیا تھا۔ اور عورتیں ہونے کے باوجود انکا جی چاہ رہا تھا۔ اس ملکہ جہاں تاب سے دیوانہ وار عشق کرنے لگیں۔

پانچواں باب

اسے انتخاب کے تجویہ کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس سے کہیں زیادہ شدید احساس اس میجر منتو کے دل و دماغ پر اس لمحہ مسلط تھا جب وہ متواتر ڈھائی گھنٹے کی دیوانہ وار ڈرائیو کے بعد علی گڑھ کے ایک دور افتادہ رسٹ ہاؤس میں پہنچا۔

اس رسٹ ہاؤس کے سوا اسے اس علاقہ میں کوئی اور محفوظ جگہ معلوم نہ تھی۔ اس نے اس کا انتخاب محض اس لئے کیا تھا کہ اس کے عملہ سے اسے پوری واقفیت تھی۔ وہ یہاں ایک بار پہلے بھی آ چکا تھا۔ اور جانتا تھا کہ یہ رسٹ ہاؤس بڑی سڑک سے دور ہونے کے سبب، اکثر بے آباد رہتا ہے۔

اس کی موٹر جیسے ہی، رسٹ ہاؤس کی چہار دیواری میں داخل ہوئی، رسٹ ہاؤس کے مختصر سے عملہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، انہوں نے موٹر کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور جھک جھک کر اسے میجر کو سلامیں کرنے لگے۔ جو ان کو انعام دینے کی خاطر اتنی دور چل کر یہاں پہنچا تھا۔

میجر منتو نے ان کی سلاموں پر کچھ زیادہ توجہ دیئے بغیر زمرد بیگم کو جو اس وقت سے اب تک گٹھڑی بنی پچھلی سیٹ پر بے حس و حرکت بیٹھی تھی، موٹر سے باہر نکالا، عین اس لمحہ جب وہ اسے باہر لا رہا تھا اسکی نگاہ اسکے جسم کے اس حصہ پر اٹھ گئی جو نزہت کے خون سے داغدار تھا۔

میجر منتو نے، خون کے یہ داغ کیا دیکھے، اس کے جسم کو ایک عجیب لرزے نے چھو لیا۔ ایسا لرزا تو اس کے جسم پر، اس پورے وقفہ میں ایک بار بھی تو طاری نہ ہوا تھا۔

یہ لرزہ اس وقت تو بہت بڑھ گیا جب رسٹ ہاؤس کے عملہ کی نگاہیں، اس زمرد بیگم کے لباس پر اٹھ گئیں۔ میجر نے یہ نگاہیں دیکھیں، اس کا جی چاہا،

اسے کاش وہ ان سب آنکھوں کو بینائی سے محروم کر دے۔ مگر یہ خواہش، محض وہم یا اس کے دل کے اپنے ڈر کی پیداوار تھی۔ بھلا کسی آدمی کے دل میں کسی قسم کا کوئی شک پیدا نہ ہوا تھا۔ وہ بے چارے تو سمجھ رہے تھے۔ بیگم صاحب، رستہ میں کہیں کسی حادثہ میں مجروح ہو گئی ہیں جب یہی بات، خانساماں نے کسی قدر رک رک کر میجر منّو سے کہی تو میجر کو ایسا لگا جیسے اس کے ذہن کو جھٹکے دینے والا زلزلہ، آپ ہی آپ رک گیا ہے۔ ذہین آدمی تھا۔ خانساماں کی بات کا جواب دئے بغیر، زمرد کو جو موٹر کے بڈ کے سہارے کھڑی اس ماحول کو تھکی تھکی اور پریشان نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اپنے جسم پر لاد کر، تیز تیز قدم اٹھاتا برآمدہ کی طرف بڑھا۔

اور ان غریبوں کا کام، ان بڑے لوگوں کی خدمت تھی۔ وہ میجر کے تیز تیز کھا گتے ہوئے میجر سے پہلے برآمدہ میں آئے۔ اور ایک بڑی سی آرام کرسی، آگے کی طرف سرکار کر میجر سے درخواست کی۔

سرکار! بیگم صاحبہ کو اس آرام کرسی پر لٹا دیجئے۔ ہم ابھی پلنگ پر آپ کا بستر کھول کر بچھا دیتے ہیں۔

مگر سرکار بستر کہاں ساتھ لائے تھے۔ زمرد کو آرام کرسی پر لٹاتے ہوئے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔

لیکن بھئی۔ ہم بستر تو ساتھ نہیں لائے۔

ہم گھر جا رہے تھے۔ کہ اچانک یہ حادثہ پیش آگیا اور ہمیں سفر ملتوی کر کے یہاں آنا پڑا۔

وہ ذرا رکا، اور خانساماں کی طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔

ارے حضرات۔ ہمارے اس قدیم اڑدخاں کے ساتھ ایک عدد بڑی ہی خوبصورت بیگم صاحبہ بھی ہیں۔

ہمیں یقین تو نہیں کہ ان حضرت نے ان سے شادی کی ہو۔ بہرحال ہم آپ کا تعارف ان سے بھابی کی حیثیت میں ہی کرائیں گے۔

میجر منو کے چہرے پر زردی کے بادل امنڈ آئے تھے۔ اسکو اپنا گلا کچھ عجیب طرح سے خشک خشک محسوس ہو رہا تھا۔ اگر کرنیل لقمان کی جگہ کوئی اور کرنیل کیا بریگیڈیئر۔ لفٹنٹ جنرل بھی کیوں نہ ہوتا۔ وہ کبھی اس طرح کے گستاخانہ انداز گفتگو کو برداشت نہ کرتا۔ مگر یہاں تو بات ہی دوسری تھی۔ اسے ناچار چپ رہنا پڑا۔ دونوں لفٹنٹ کرنیل اور میجر، ان کے قریب آن کھڑے ہوئے تھے اور کرنیل لقمان، ان تینوں سے اس میجر منو کا تعارف کرا رہا تھا۔ جب ان کا تعارف ختم کر چکا تو آپ ہی موٹر کا دروازہ کھولا اور زمرد بیگم کی طرف ہاتھ بڑھا کر التجا کی۔

محترمہ بھابی صاحبہ، خواہ آپ ہمارے دوست کی اصلی بیوی ہیں یا نقلی ذرا باہر تشریف لے آئیے۔ ہم سب آپ سے ملنے کے لیے بے تاب ہیں۔ اور اس بنجر جگہ پر جہاں پتھروں اور کنکروں کے سوا کوئی ہریالی نہیں ہے۔ آپ [illegible] مجسّم ظاہر ہوں گے۔ جیسے ہمارا آپ کا تعارف اٹلی کے کسی مرغزار میں ہوا۔

زمرد بیگم، ان لوگوں کے موٹر کے پاس آن کر رکنے کے وقت سے اب بڑے خوفناک الجھاؤ میں الجھی تھی، اس کا دل بے طرح دھک دھک کر رہا [illegible] لقمان کی اس گفتگو سے وہ بے حد گھبرائی۔ ڈری ڈری نگاہوں سے [illegible] کی طرف دیکھ کر سہما سہما دیکھ کر بے اختیار مسکرا دیا۔ اور پہلے سے کہیں زیادہ [illegible] کے ساتھ

خدا کی قسم یہ بات تحقیق ہو گئی کہ تو اسے خوبصورت عورت ہمارے دوست کی یا تو نقلی بیوی ہے۔ یا منگیتر ہے۔ اور اس میجر منّو سے کورٹ شپ کر رہی ہے۔

زمرد بیگم کے خوبصورت چہرے کی رنگت پہلے سے بھی پیلی پڑ گئی، کرنیل لقمان کا ہاتھ ابھی تک پھیلا ہوا تھا۔ مگر زمرد اپنی جگہ سے ہلی نہ تھی۔ میجر منّو نے اپنے اس قدیم ساتھی کی اس بے باکی کو گو پہلے سے بھی زیادہ محسوس کیا۔ لیکن وہ اس لمحہ لڑنے کے عالم میں نہ تھا۔ اس پر تو "فراریت" کی دہشت اور اس کے اثرات مابعد طاری تھے۔ وہ تو خون کر کے بھاگا تھا۔ اور خون کا عادی نہ ہونے کے سبب اپنے اس جرم پر بہت بری طرح پچھتا رہا تھا۔ اس نے کرنیل لقمان کی بات کو طول پکڑنے سے بچانے کے لئے زمرد بیگم سے التجا کی۔

کرنیل صاحب کی دعوت قبول فرمائیے۔ کرنیل صاحب میرے اس وقت کے ساتھی ہیں۔ جب ہم

اگلی بات کرنیل نے پوری کی۔

جب ہم اسے خوبصورت عورت تمہاری ایسی خوبصورت عورتوں کا شکار اکٹھے کیا کرتے تھے۔

اور یہ کہہ کر بہت زور کا قہقہہ مارا۔ میجر منّو نے پہلی بار احتجاج کیا۔

لقمان بھائی! تم ذرا زیادہ بے تکلف ہو گئے ہو۔ یہ وہ خاتون ہے جسکے پاؤں پر

نے کوئی سو سجدے کئے ہیں۔ اور ابھی جذبہ عبودیت تسکین نہیں پا سکا۔

کرنیل نے پھر ایک قہقہہ مارا۔

ہاں واللہ، یہ تو میں نے اس خاتون کی خوبصورت شکل دیکھ کر ہی سمجھ لیا تھا

ایسی حماقت سو بار کی ہو گی!

یہ تو تمہاری قدیم عادت ہے۔ یہ تو تم تین پگ پینے کے بعد ہر اس عورت کے

ساتھ کرنے کے پرانے عادی ہو۔ جو تمہارے حضور آن پہنچی۔

میجر کے چہرے کی رنگت بالکل سیاہ پڑ گئی۔ اور قریب تھا کہ وہ اپنا دماغی توازن کھو دے کہ زمرد بیگم کرنیل لقمان کے ہاتھ کے سہارے باہر آگئی۔ اوران سب نے اس کے قد رعنا، اسکے متناسب اعضا، اسکی انتہائی دلفریب اور مستی بھری آنکھیں دیکھ کر، اپنے سر اسکے اعزاز میں جھکا دیئے۔ اور کرنیل لقمان کو زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ۔

اس دنیا میں ایسی عورتیں بھی ہیں جن کے سامنے جابر سے جابر مرد اپنی پیشانی ٹیک دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

زمرد ایسی ہی عورتوں میں تھی اور کرنیل لقمان قریب قریب رکوع کے بل جھک کر زمرد بیگم سے معافی چاہ رہا تھا۔

میں بے حد نادم ہوں، محترمہ کہ میں نے انجانے پن میں ابھی ابھی کچھ گستاخیاں آپ کی خدمت میں کیں۔

زمرد بیگم مسکرائی! اوران سب کو ایسے لگا، جیسے، یہ چاروں جانب پھیلی بے جان سی فضا، کنکریلی زمین، بنجر سی چٹانیں۔ لہلہاتے سبزہ زاروں، اور دیکھتے عطر بیز باغیچوں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ ہر طرف پھول کھلے ہیں اور کلیاں مسکرا رہی ہیں۔

اس احساس کے ساتھ ان سب نے، باری باری جھک کر، اُسے خراج ادا کیا،

صاحب داد خان اور دوسروں نے، ہیڈ کوارٹر کیمپ کی میزوں اور کپڑے کی کرسیوں پر قبضہ کر لیا تھا، چائے، پیالیوں میں انڈیلی جا رہی تھی اور بسکٹوں کے ڈبے کے ڈبے کھول کر پھیلا دیئے گئے

کرنیل نے جھجکتے جھجکتے، زمرد بیگم سے التجا کی۔

اس سفر میں، آپ نے ہمیں اپنے حضور پیش ہونے کی جو سعادت بخشی ہے۔

اس میں اضافہ فرمانے کے لیے، ذرا دو قدم ادھر کی طرف بڑھا لیں۔ صاحب داد خاں نے چائے میزوں پر رکھ دی ہے۔

زمرد بیگم شرمائی شرمائی، ادھر بڑھی۔ وہ پانچوں بھی اس کے پیچھے چلے۔ وہ اس طرح قدم اٹھا رہے تھے جیسے وہ بہت بڑی جرنیل تھی اور وہ معمولی سپاہی تھے۔

صاحب داد خاں بڑا کائیاں تھا۔ زمرد بیگم کو دیکھتے ہی سیلوٹ مارا۔ زمرد شائد پہلی دفعہ مسکرائی اور اس کرسی پر بیٹھ گئی جو سب سے قریب تھی اور ان سب سے بھی درخواست کی۔

تشریف رکھیں۔

وہ سب جھینپ رہے تھے خصوصیت سے کرنیل لقمان جنہوں نے حد سے زیادہ شوخیاں فرمائی تھیں شرم کی چادر میں منہ چھپائے تھے۔ زمرد بیگم نے دوبارہ درخواست کی، تو یہ لوگ کرسیوں پہ بیٹھے۔ اور چائے شروع ہوئی۔

زمرد بیگم اور منو بہت بھوکے تھے یہ تو انہیں اس وقت احساس ہوا جب بسکٹ ان کے منہ تک آئے منو کو اس ملاقات میں خواہ کوئی اور بھلائی نظر آئی ہو یا نہ آئی ہو۔ اس کے دل و دماغ پر چھایا ڈر تو قطعاً ختم ہو گیا تھا۔ کرنیل لقمان سے مل کر اسے اس طرح محسوس ہوا تھا جیسے اس نے بالکل کوئی بری حرکت نہیں کی یا جیسے وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں اسے پکڑنے کے لیے کوئی پولیس نہیں پہنچ سکتی۔ کرنیل لقمان بڑا جی دار بڑا اونچا صاحب کردار۔ اور بڑا زود دوست تھا۔ اس میں یقیناً کچھ کوتاہیاں تھیں۔ اس کے کردار کی کئی کڑیاں کبھی کبھی ڈھیلی ہو جاتیں لیکن اس میں دوست کو پناہ دینے کی بلا کی قوت تھی۔

منّو کو لقمان کا یہ وصف معلوم تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے پیتے منّو کے دل میں اچانک خواہش پیدا ہوئی، بھوپال جانے کی بجائے کیوں نہ، لقمان کے پاس پناہ لے۔ لقمان کی نقل و حرکت کے متعلق اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ تین سال پہلے، اس نے کئی سال بعد اسے اس وقت دیکھا تھا جب وہ لفٹنٹ کرنل بننے کے بعد، اس سے تین راتوں کے لئے جنرل ہیڈ کوارٹر آیا تھا۔ پوری تین راتیں تو نہیں البتہ دو راتیں اس نے اس منّو کے ساتھ کاٹی تھیں۔ دو راتوں کاٹنے کے بعد وہ پھر ایسا گم ہوا۔ کہ اچانک آج نظر پڑا۔ اسے اس ایریا میں دیکھ کر منّو کو خیال ہوا، یقیناً۔ یہ کہیں وجیا نگرم یا کسی دوسری ادھر کی بریگیڈ میں یہ کام کر رہا ہے۔ چائے کی آدھی پیالی اور دو بسکٹ حلق سے اتارنے کے بعد، منّو نے اچانک اپنا ہاتھ لقمان کے بازو پر رکھ دیا۔ اور اپنی جگہ سے کسی قدر اوپر کو اٹھتے ہوئے لقمان کو آنکھ سے اشارہ کیا کہ وہ بھی اُٹھے۔ لقمان مسکرا دیا۔ اُٹھا۔ دونوں نے زمرد بیگم اور ساتھیوں سے سر جھکا کر معذرت کی اور کسی قدر فاصلے پر چلے گئے۔ وہاں منّو نے بغیر کسی جھجھک کے کرنل سے ساری بات کہہ دی۔ لقمان کا چہرہ، انتہائی سنجیدگی اختیار کر چکا تھا۔ یہ تو بڑی خطرناک پوزیشن تھی جو اس کے دوست نے پیدا کر لی تھی۔ اس میں مدد کرنے کے معنی یہ تھے کہ وہ آپ مصیبت میں مبتلا ہو جائے اس نے منّو کی ساری روئداد سن کر دو تین منٹ کی خاموشی کے بعد جب زبان کھولی تو منّو سے کہا۔

منّو! تو فوج میں میجر ہے۔ اگر میجر نہ ہوتا۔ تو میں تجھے سپاہیوں میں بھرتی کر کے آج ہی محاذ پر بھیج دیتا۔

تمہیں شاید معلوم نہیں۔ یہ میرا بھرتی کا ایریا ہے۔ اور میں تجھے ایک

فرضی نام سے بھرتی کر کے۔ آج ہی کے بیچ سے بمبئی بھیج سکتا تھا۔ اور پھر سمندر پار پہنچ کر، تم قانون کی گرفت سے بچ جاتے۔

منّو کی سمجھ میں اور تو کچھ نہیں، از سرِ نو فرضی نام سے بھرتی ہونیکے خیال نے اس کے ذہن کو جکڑ لیا۔ اور اس نے نعمان سے التجا کی۔

نعمان، تمہارا مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ اگر تم اب بھی مجھے فرضی نام سے بھرتی کر کے سمندر پار بھیج دو۔

تم جانتے ہو۔ میں بڑا اچھا ڈرائیور ہوں، اور موٹر کے کل پرزوں کو جوڑنے میں بھی مہارت رکھتا ہوں۔

کرنل نعمان کے چہرے پر چھائی پریشانی، پہلے سے بھی گہری ہوگئی۔ اور اس نے سوچا اگر یہ بات کسی طرح ہیڈ کوارٹر کو معلوم ہوگئی تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ مگر منّو کے چہرے پر چھائے اضطراب نے۔ اسے اس خطرہ کے مول لینے کی بڑی سخت تحریک کی۔ اور اس نے منّو کا ایک ہاتھ اپنی گرفت میں لیتے ہوئے بہت ہولے سے کہا۔

یہاں سے چند میل کے فاصلے پر، کل مجھے نئی بھرتی کرنی ہے تم اگر میرے ساتھ وہاں تک چلو۔ تو میں تمہیں پہلے ہی بیچ میں بھرتی کر لوں گا۔

لیکن شرط یہ ہے کہ تم قسم کھاؤ کہ کبھی کسی وقت بھی یہ راز افشا نہیں کرو گے۔

منّو نے قسم کھائی۔ اور دونوں دوست پہلے سے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ اپنی جگہ پر آن بیٹھے، زمرد بیگم نے ان کو بڑے تعجب کے ساتھ دیکھا۔ منّو کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہی وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ چائے ختم ہوئی۔ کرنل نعمان نے گھڑی دیکھی ساڑھے چار بج چکے تھے اور دسمبر کا شرمیلا چاند، دبے پاؤں جنگل میں اپنا زرد زرد

چہرہ چھپانے کے لئے تیزی سے نیچے کو بھاگ رہا تھا۔

بڑہوتی کے ڈاک بنگلہ میں انہوں نے اکٹھے یہ رات بسر کی۔ منّو نے زمرد بیگم سے اپنے فیصلہ سے متعلق ایک حرف نہیں کہا۔ البتہ رات بھر وہ زمرد کے پاؤں پر سر رکھے، بچوں کیطرح روتا رہا زمرد اس کا سر بار بار اُٹھا کر اپنے سینہ پر رکھ لیتی اور اس سے التجا کرتی۔

خدا کے لئے، اس طرح نہ رو دیئے۔ میں غم کے مارے پاگل ہو جاؤں گی۔

مگر یہ تو منّو کو معلوم تھا کہ اس کے دل پر آنے والی جدائی کے سبب کیا بیت رہی ہے۔ اچانک اس کی زندگی میں محبت کی جو شمع روشن ہوئی تھی، وہ صرف چند راتیں جلنے کے بعد فراق کی اندوہناک آندھی سے بجھنے کو تھی۔ وہ ڈوبتے دل اور لرزاں دماغ کے ساتھ سوچ رہا تھا کل کے بعد وہ زمرد کو نہ جانے کب مل سکے گا۔ اور آیا مل بھی سکے گا یا نہیں۔

یہ غم، کوئی معمولی غم نہ تھا۔ یہ بے چینی کوئی معمولی بے چینی نہ تھی۔

زمرد کو اس آنے والے لمبے فراق کی خبر نہ تھی، پکڑے جانے کا ڈر یقیناً تھا۔ مگر میجر ہی نے اسے امید دلائی تھی کہ بھوپال پہنچ کر نواب زادہ سعید خاں کی مدد سے کوئی چھپنے کی جگہ ڈھونڈ لے گا۔ بے چاری نہیں جانتی تھی کہ کرنل نعمان رستہ ہی میں مل کر اس پروگرام کو ایک فوری فراق میں بدل دے گا۔ اس فوری فراق کے متعلق تو اسے اس وقت بھی کوئی گمان نہیں ہوا جب ڈاک بنگلے کے وسیع احاطہ میں سب سے پہلے پیش ہونے والے جوانوں میں اُسے منّو بھی ایک معمولی دیہاتی مستری کے بھیس میں شامل نظر آیا۔ وہ سمجھی منّو نے جان بوجھ کر بھیس بدلا ہے اور اس طرح، چھپنے کی کوئی اور آسان بات سوچ لی ہے۔ نہیں جانتی تھی۔ چند لمحوں میں منّو اس سے اجازت لئے اور اس کی پیشانی پر الوداعی مہر ثبت کئے بغیر، ڈاک بنگلہ سے باہر کھڑے ایک بہت

بڑے ملٹری ٹرک میں بیٹھ جائے گا اور یہ ٹرک اس طرح بھاگ نکلے گا جیسے اس زمین سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ اس نے اسے ٹرک میں لاتے نہیں دیکھا صرف، کرنیل لقمان، کے سامنے آتے دیکھا۔ اپنے اس دیہاتی لباس میں منّو کتنا وجیہہ دکھائی دیتا تھا۔ اور جب کرنیل لقمان نے اسکے مضبوط بازوؤں میں اپنی انگلیاں چبھوتے ہوئے کہا۔

جوان تمہارے بازوؤں میں بڑی قوت ہے۔ تم سپوی ٹرک خوب چلا لوگے۔

تو منّو نے صرف سر ہلایا، کوئی جواب نہیں دیا۔ اور پھر لفٹننٹ کرنیل ڈاکٹر ممتاز ایسے ہی رسمی طور پر، اس کا بھی معائنہ کرنے کے لئے اسے ذرا فاصلے پر لے گئے۔ اس کے بعد زمرد اسے نہ دیکھ سکی۔ وہ کرنیل لقمان کی دلچسپ حرکات میں اُلجھ گئی اس بے چاری زمرد کو تو ایک چوتھائی حقیقت اس وقت معلوم ہوئی جب کرنیل لقمان، لنچ کھانے کے لئے اس کے پاس آیا۔ وہ کچھ اُلجھا اُلجھا سا تھا۔ اس نے منّو کے متعلق زمرد بیگم کے کئی خیالات بیرے سے پائے تھے۔ مگر ان سب کا جواب صرف یہ دیا تھا کہ لنچ کے وقت کہوں گا منّو کہاں بھیجے گئے ہیں۔

جیسے ہی کرنیل لقمان نے اندر قدم رکھا، زمرد ان پر قریب قریب گر پڑی، اور بچوں کی سی معصومیت اور اضطراب کے ساتھ پوچھا۔

یہ منّو کو آپ نے یہ بھیس کیوں بدلوایا، کیا اس میں کوئی بھلائی تھی۔

کرنیل لقمان اس حقیقت کو کہنے کی ہمت نہ رکھتا تھا، اس نے اس سے منّو کے بھیس بدل کرنے، سرسے سے بھرتی ہونے کی بات تو کہہ دی، لیکن یہ نہیں بتایا کہ منّو چند میل کے فاصلے پہ واقع ریلوے اسٹیشن سے اس اسپیشل ملٹری ٹرین میں بیٹھ گیا ہے جو بمبئی جا رہی ہے اور جس کے مسافر تیسرے دن سمندر پار جانے والے بحری جہاز پر بیٹھ جائیں گے۔

اس نے روتی اور بلکتی زمرد سے اس نئی بھرتی کا سبب کہہ دیا۔ اور ان خطرات سے بھی آگاہ کر دیا جو اس اقدام کے بغیر منو کے مستقبل کو دھندلا کر دیتے اس نے کہا۔

منو اگر آج ایک دیہاتی کی صورت میں بھرتی نہ کیا جاتا۔ تو اس کا چھپنا آسان نہ ہوتا۔ وہ ایک مشہور اور بڑے خاندان کا فرد ہے۔ اس کے جاننے والے بہت ہیں، آج ہی کی مثال سامنے رکھیئے۔ میں اچانک ان کا رستہ روک کر کھڑا ہو گیا، اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو جانتی ہیں آپ اس کے نتائج کیا ہوتے۔ اس لئے بہتر یہی سمجھا گیا کہ منو کو فوج میں کام کرنے والے منتریوں میں بھرتی کر کے کسی دور کی جگہ بھیج دیا جائے۔

وہ وزائر کا۔ زمرد کی طرف دیکھا اور خود پر کسی قدر قابو پاتے ہوئے بات جاری رکھی۔

وہ ایسی محفوظ جگہ بھیجے گئے ہیں۔ جہاں ان کا پتہ بھی نہ چلے اور ان پر کوئی آنچ بھی نہ آئے۔

زمرد نے اچانک اسکے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور بلکتے ہوئے پوچھا۔

کیا سچ مچ ان پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ آپ کو اس بات کا اطمینان ہے۔

کرنیل لقمان نے جواب دیا۔

مجھے اس کا پورا اطمینان ہے۔ آپ بھی اطمینان رکھیئے۔

اور بھولی زمرد منو کے محفوظ مستقبل کے خیال سے کسی قدر مطمئن ہو گئی۔ اس کی سسکیاں رک گئیں اور اس کے دل و دماغ پر چھائے اضطراب میں کچھ کمی آ گئی گو اب بھی اس کی آنکھیں بہہ رہی تھیں، گو اب بھی، اس کی لا بنی لا بنی قاتل آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ رہے تھے، مگر وہ پہلا جیسا اضطراب نہ تھا۔ اور کرنیل لقمان اس کے قریب کھڑا عجیب الجھاؤ میں الجھ گیا تھا۔ زندگی کو محض ایک کھیل، ایک ہنگامہ اور ایک مسلسل حرکت

سمجھنے والا کرنل، کچھ اس طرح محسوس کر رہا تھا جیسے۔ یہ سامنے بیٹھی زمرد اسے کسی ایسی زندگی کی دعوت دے رہی ہے۔ جس میں آنسو اور آہیں بھی ہیں۔

یہ روتی زمرد کرنل لقمان کو پہلے سے زیادہ حسین، پہلے سے زیادہ پُر وقار اور بڑی عورت معلوم ہوئی۔ اور اس کے دل میں پہلی بار یہ خواہش جاگی اے کاش، کوئی حسین عورت اس کے لئے بھی اسی طرح آنسو بہاتی جس طرح یہ زمرد منّو کیلئے بہا رہی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے کرنل لقمان نے جب کبھی بھی کسی عورت کو آنسو بہاتے دیکھا تو بے اختیار ہنس پڑا تھا اور منہ دوسری طرف موڑ کر اس عورت کی حماقت پر سخت احتجاج کیا تھا۔

اس وقت اس کی نگاہ، اس روتی زمرد پر جم سی گئی تھی۔ جیسے ہی آنسو موتیوں کی طرح، اس کی لانبی لانبی قاتل آنکھوں سے نکل کر، اسکے خوبصورت گالوں پہ لڑھکتے۔ لقمان، کی نگاہ، ان خوبصورت آنکھوں سے پھسلتی آنسوؤں کے ساتھ ساتھ اس کے گالوں پر سے ہوتی صراحی دار گردن پر آن رکتی اور پھر نہ جانے کیوں، زمرد کے جوان سینہ پر نگاہ ڈالے بغیر، نظر کو لوٹا لیتا۔

یہ تماشہ کتنی دیر تک ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر ممتاز نے اندر قدم رکھا اور بڑے ادب کے ساتھ درخواست کی۔

"کھانا میز پر لگ چکا ہے۔ اگر آپ دونوں تشریف لے آئیں تو اس ضرورت سے فراغت ہو جائے۔

ابھی پانچ سو آدمیوں کا اور گروہ، بھرتی کے لئے باہر کھڑا ہے۔

کرنل لقمان نے پوچھا!

کیا میجر سلیم اتنا کام بھی نہیں کر سکتے کہ ان لوگوں کی لسٹ تیار کر لیں۔

ہم اسی لیئے تو کسی دوسرے ڈاک بنگلہ کی طرف نہیں گئے کہ مجھے معلوم تھا
تمہارے ہاں بستر موجود ہیں۔

خانساماں نے ادب سے سر جھکا لیا۔ اور ذرا رُک کر جواب دیا۔
سرکار، بستر تو، یہاں یقیناً ہیں۔ لیکن آپ کی شایان شان نہیں ہیں۔
اور خاص طور پر بیگم صاحبہ کے لیئے تو یہ کسی طرح موزوں نہیں ہونگے۔
میجر نے بات کاٹ لی۔

تم اس کی فکر نہ کرو، حادثوں میں موزونیت کون دیکھتا ہے۔
جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے، بچھا دو۔ ایک رات ہی تو بسر کرنی ہے۔
خانساماں کا جی چاہا کہے۔

عالی جاہ! ایک رات کے قیام سے تو ہم لوگوں کا کوئی بھلا نہ ہوگا،
ہم تو آپ لوگوں ہی کے سہارے جیتے ہیں۔ ایک آدھ ہفتہ تو ضرور
ٹھیریئے پچھلی دفعہ تو آپ دس دن ٹھیرے تھے۔

مگر وہ اس بڑے صاحب کے مزاج سے واقف تھا، کچھ کہے بغیر، اندر
کی طرف لپکا۔

میجر نے پاس کھڑے بیرے کو حکم دیا۔
دیکھو بھئی جب تک خانساماں آئے۔ تم تھوڑا سا پانی گرم کر لاؤ،
میں ذرا بی بی کا زخم دھو دوں۔

بیرہ بھاگا، تو میجر نے حلال خور پر توجہ کی تم ذرا بھئی کوئی اچھا سا کمرہ
ہمارے لیئے صاف کر دو۔

حلال خور بھی رخصت ہوا، تو بجر نے، قریب قریب بے حس وحرکت زمرد کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیئے۔ اور بچوں کی سی معصومیت کیساتھ التجا کی۔

زمرد مجھے معاف کر دو، میں نے جو کچھ کیا، بجا کیا اور اگر مجھے تمہاری عزت بچانے کے لیئے، ساری دنیا سے لڑائی مول لینی پڑتی تو خدا جانتا ہے میں کبھی دریغ نہ کرتا!

زمرد نے اس دقعہ میں پہلی بار، منتو کی آنکھوں سے اپنی قاتل اور انتہائی حسین آنکھیں دوچار کیں، ان آنکھوں میں کتنی مستی، کیسی دلاویزی اور کیسی رعنائی تھی کہ منتو کا جی چاہا اس لمحے زمرد کے پاؤں پہ گر جائے اور چیخ چیخ کر کہے۔

زمرد! یہ تو ایک نزہت تھی، اگر میری ماں، میرے خاندان کے دوسرے لوگ تمہارے ساتھ وہی سلوک کرتے جو نزہت نے کیا، تو میں ان سب کو گولی مار دیتا میں ان سب کا خون پی لیتا۔

یہ خوبصورت آنکھیں، دوسرے لمحہ ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی تھیں۔۔۔۔ اور زمرد سسکیوں کی سی آواز میں کہہ رہی تھی!

لیکن میرے آقا، تمہیں ایسی حرکت زیب نہ دیتی تھی۔

منتو نے کچھ کہے بغیر، اپنا سر ان پاؤں پر رکھ دیا۔ زمرد نے اپنے پاؤں سکیڑ لیئے اور منتو کے سر کو اوپر کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

ایسا نہ کیجئے میرے آقا! یہ بات بھی آپ کو زیب نہیں دیتی۔

منتو کا جی چاہا۔

زمرد کے اس ظلم کے خلاف زور زور سے رونے لگے، اور رو رو کر اس خود ی پر احتجاج کرے اور کہے۔ تم کیا جانو زمرد، میری نگاہ میں تمہارا مقام کیا ہے۔

میرے نزدیک، تمہارے پاؤں کتنے تقدس کے مالک ہیں۔

ابھی وہ کچھ کہہ نہیں پایا تھا کہ خانساماں نے حاضری دی، اور عرض کیا۔

سرکار بستر بچھا دیے ہیں، میرے پاس بالکل نئی چادریں تھیں میں نے انہیں اوپر ڈال دیا ہے۔

پھر ذرا رُک کر پوچھا۔

بیگم صاحبہ کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔

میرے پاس کوئی اور چیز تو نہیں لیکن کیورا مرہم ہے، اگر فرمائیں تو اسے حاضر کردوں۔

میجر نے جواب دیا!

اچھی بات ہے، لے آؤ، لیکن پہلے ہمیں اس کمرہ تک لے چلو، سردی کچھ زیادہ ہوتی جارہی ہے۔ کہیں کچھ اور نہ ہو جائے۔

خانساماں نے رہنمائی کی، میجر نے زمرد کو پھر گود میں بھرا، اور اس کمرے میں لے گیا جس کی طرف خانساماں نے راہ نمائی کی تھی۔

کمرہ، بہت خوبصورت اور بڑا آرام دہ تھا۔ پاس پاس دو بستر بچھے تھے ان کے اوپر گدے گدیلوں کے اوپر سفید چادریں ڈلی تھیں، میجر نے ایک بستر پر زمرد بیگم کو اتارا، اور ان کے لحاف اڑھا کر، خانساماں سے کہا۔

بھئی تم وہ مرہم بھی لے آؤ، اور ذرا انگیٹھی میں آگ بھی جلا دو۔ اور اگر کچھ برانڈی وِرانڈی ہو تو . . . . بہت اچھا ہو۔

ہم لوگ ذرا سردی زیادہ کھا گئے ہیں۔

خانساماں نے ادب سے سر جھکا دیا اور باہر نکل گیا۔

یہ ان دونوں پر عجیب دلاویز، اور ہزاروں لطافتوں سے بھری ہوئی رات تھی۔ برانڈی کے آتشیں قطرات نے ان کے جسم بھی گرما دئے تھے اور دلوں سے اندیشۂ فردا بھی چھین لیا تھا۔ دونوں ایک ساتھ مل کر کبھی بہاروں کے گیت گاتے کبھی حسین فضاؤں میں پرواز کرتے۔

یہ وسط دسمبر کی ٹھنڈی رات تھی۔ اور یہ ٹھنڈی رات جب ختم ہوئی تو دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر یوں سوئے پڑے تھے جیسے کبھی جدا نہ ہوں گے۔ مگر صبح جب دسمبر کا بھیگا بھیگا سورج دور جنگلوں کے عقب سے ابھرا تھا۔ اور اس کی لال لال شعاعیں ہر سو پھیل نکلیں۔ تو آپ ہی آپ، یوں جاگ اٹھے جیسے ہر سو خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ پہلے زمرد جاگی۔ اس نے ابھی ابھی ایک خواب دیکھا تھا۔ کتنے ہی لوگ، جن میں سینکڑوں باوردی سپاہی آگے آگے تھے۔ ان دونوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور وہ دونوں ان سے بچنے کے لیے پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ تعاقب ہر لحظہ شدید ہوتا جا رہا تھا وہ جہاں چھپتے وہیں لوگ آن پہنچتے اور پھر ایک بڑے گروہ نے میجر کو چاروں طرف سے گھیر لیا، زمرد چیخ اٹھی، اس کی آنکھ کھل گئی، منو ساتھ لیٹا تھا۔ مگر پھر بھی اس خواب نے زمرد کے حواس پر کچھ ایسا ڈر غالب کیا تھا کہ وہ کتنی دیر تک کانپتی رہی اسنے کانپتے کانپتے منو کو جگایا اور اپنا یہ خواب اس سے کہہ دیا۔ منو کا دل آپ ہی آپ، ایک عجیب لرزے کے جھٹکے محسوس کرنے لگا۔

رات جس بات کو ان دونوں نے برانڈی کی مدد سے بھولنے کی کوشش کی تھی ایک خوفناک اژدھے کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ وہ دونوں ایک ساتھ پلنگ پر سے اٹھے اور ایک جیسے احساس کے ساتھ اپنے چسٹر پہن کر باہر آئے۔

باہر رسٹ ہاؤس کا حلال خور محض ان کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ان کو اس طرح گھبرائے گھبرائے باہر آتے دیکھا۔ تو پوچھا۔

کیا سرکار چائے پیئے بغیر تشریف لے جائیں گے؟

وہ دونوں جس الجھاؤ میں اچانک الجھ گئے تھے۔ اس میں چائے پینے کا ہوش انہیں کہاں تھا۔ لیکن حلال خور کے اس سوال نے میجر منو کو ایک بہت ضروری بات یاد دلا دی۔ اسے خانساماں کا بل اور حق خدمت بھی تو ادا کرنا تھا یہ اتنی ضروری بات اس الجھاؤ میں الجھنے کے سبب اس کے ذہن سے نکل گئی تھی اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا، اور ایک سو روپے کا ایک نوٹ حلال خور کے ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

یہ نوٹ تم لوگ آپس میں بانٹ لینا۔ ہمیں بہت جلدی ہے چائے نہیں پئیں گے۔

ابھی وہ موٹر کے قریب پہنچے ہی تھے کہ خانساماں بھی آن پہنچا، اور میجر نے حلال خور کی طرف اشارہ کیا۔

ہم نے اسے بل اور تم لوگوں کے حق خدمت کی رقم دے دی ہے

حلال خور نے بہت بددلی سے سو کا نوٹ جسے اس نے اندر کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ باہر نکال کر خانساماں کے حوالے کیا۔

خانساماں رکوع کے بل جھک گیا۔

میجر منو اور زمرد بیگم کو اس کے اس طرح جھکنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی انہیں تو اسے دیکھنے تک کا ہوش نہ تھا۔ وہ ایک ساتھ موٹر میں بیٹھے، ایک ایک دروازے سے اور دوسرا دوسرے دروازہ سے، موٹر ایک بار پھر چلی اور اپنے پیچھے غبار کے بادلوں کے سوا اور کچھ نہ چھوڑ گئی۔

خانساماں، بیرہ اور حلال خور، حیران حیران نگاہوں سے اس غبار کو دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے صاحب جس خوبصورت عورت کو ساتھ لائے یہ ان کی نہ تھی، یہ کوئی وہ عورت تھی، جو عیاشی کا سامان مہیا کرتی ہے۔ مگر یہ عورت کتنی خوبصورت تھی، اس کے زرد زرد چہرہ میں کتنی رعنائیاں تھیں۔

رعنائیوں کی یہ دنیا منجو منتو کے پہلو میں بیٹھی، اسے ایک ہی بات کہہ رہی تھی۔
اگر ہم پکڑے گئے تو آپ کا جرم میں اپنے ذمہ لے لوں گی، میں عدالت سے کہوں گی میں نے نزہت بیگم کو گولی ماری تھی۔

منتو اس کے جواب میں کچھ بھی تو نہ کہتا، اتنا بھی تو نہیں۔
کہ یہ میں کیسے برداشت کرسکوں گا کہ میری بجائے، میری جان مصیبت میں پھنسے۔
اس وقت تو منتو کو ایک ہی دھن تھی، اس کے ذہن پر تو ایک ہی جنون سوار تھا، موٹر کو تیز دوڑاتا، بھوپال پہنچ جائے۔ بھوپال کے سوا اس کا ٹھکانا کہیں اور نہ تھا، بھوپال ابھی بہت دور تھا، سینکڑوں میل دور۔ اور ہر بار جب اسکی موٹر کسی شہر کے قریب پہنچتی، اس کے ذہن پر اچانک یہ ڈر غالب آجاتا اگر ہم یہاں پکڑے گئے۔ اگر دہلی کی پولیس نے یہاں کی پولیس چوکیوں کو ہمارے فرار کی خبر دے دی ہو تو؟
اگر ہر شہر کے قریب اور پھر اس کی حد کے ختم پر جب وہاں کی پولیس اس کا رستہ نہ روکتی تو اس کا دل کسی قدر بڑھ جاتا۔ یہاں تک کہ اس نے راجپوتانہ کے حدود میں قدم رکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پٹرول کی ٹینکی خالی ہوگئی تھی اسے بھرنے کے لئے اس نے، ایک پٹرول پمپ پر گاڑی روک لی، مگر ابھی موٹر کی ٹینکی بھری جا رہی تھی، کہ اچانک ایک بڑی ملٹری جیپ اس کے قریب آن رکی۔ یہ دوسری سمت سے آئی

تھی۔ اور اس میں ایک فل کرنل دو لفٹننٹ کرنل اور ایک میجر سوار تھے۔ اور یہ چاروں، زرد زرد چہرہ والے میجر منّو اور اس کے ساتھ بیٹھی انتہائی حسین خوبرو عورت کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے، اچانک ایک فل کرنل نے میجر منّو کو شیشہ کی ٹٹی کی اوٹ میں ہونے کے باوجود پہچان لیا۔ اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اُٹھا، موٹر سے اُترا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا میجر منّو کے قریب آن رُکا۔ میجر منّو نے بھی اسے دیکھا۔ تو اس کا دل بے طرح دھک دھک کرنے لگا۔ یہ تو میجر منّو کا آکسفورڈ کا ساتھی نعمان تھا۔ اس نے میجر منّو کے ساتھ ہی کمیشن لیا تھا۔ اور اپنے خاندانی روابط اور حیرت انگیز مستعدی کے سبب منّو سے پہلے کرنل بن گیا تھا ایسے پرانے دوست سے منّو تو اتنا تکلف نہ برت سکتا تھا۔ موٹر کا دروازہ کھول کر باہر آیا اور فوجی طریق سے اپنے اس دوست کو جو اس سے عہدہ میں بڑا تھا سلام کیا کرنل نعمان بے ساختہ مسکرا دیا اور اسے سینہ سے بھینچتے ہوئے سرگوشی کی۔

بڑے خوش نصیب ہو یار، ایسے پری چہروں کو پہلو میں بٹھائے پھرتے ہو۔

میجر کو اس کی یہ بے تکلفی ذرا نہ بھائی۔ اس کا جی چاہا، کرنل کی مونچھوں پر ہاتھ ڈالتے ہوئے اسے تنبیہ کرے۔

تمہاری نگاہ، بڑی گستاخ ہے جو اس ملکہ عالم پر یوں گستاخانہ اُٹھی ہے۔

کرنل کی نگاہ ابھی تک اس زمرد پر اٹکی تھی۔ اور وہ سوچ رہا تھا۔ ظالم نے بہت اونچی عورت پر ہاتھ صاف کیا ہے۔

اس کا جی بے اختیار چاہا میجر سے کہے۔

ذرا ہمارا تعارف بھی ان سے کرا دو۔ ذرا ہم بھی ایک لمحہ ان کی صحبت میں

کاٹ لیں، کرنیل نقمان، ان باتوں میں بڑا تیز تھا۔ وہ گو کچھ زیادہ خطرناک نہ تھا لیکن گھڑی دو گھڑی پری وشوں کی محبت میں کاٹ لینے کا بہت شوقین تھا۔ میجر منّو کو اس کی اس عادت سے آگاہی تھی، آکسفورڈ کے دوران قیام میں یہ میجر منّو کے وسیلہ سے یا آپ اپنی بیباکی سے اکثر، اس قسم کے موقعے پیدا کر لیا کرتا۔ میجر منّو نے ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کی تھی اور کبھی کبھی تو اپنی پسند کی عورتیں اس کی محبت میں تنہا چھوڑ کر، خود باہر نکل گیا تھا۔ اور اس وقت جب منّو ایک لمبے معانقہ میں مبتلا تھا، اسے کتنی ہی ایسی باتیں یاد آ گئی تھیں۔ جیسے ہی ان کا معانقہ ختم ہوا میجر نے کرنیل سے رخصتی کی اجازت چاہی۔ کرنیل نے حیرت سے پوچھا۔

ارے تین سال کے بعد یوں اچانک ملے ہو اور کچھ وقت ساتھ گزارے بغیر بھاگنے کی فکر میں ہو۔

خدا کی قسم میں تو کبھی ایسا کرنے نہیں دوں گا۔

پھر آپ ہی آپ، اپنے اردلی کو آواز دی۔

ارے او صاحب داد خاں، بھئی یہ میجر منّو خاں بہادر آف شمیم پور تمہاری تواضع کے بغیر بھاگنے کی فکر میں ہیں۔ ذرا اپنی چائے کی زنبیل اور کچھ دوسرے معاملات تو ان کو دکھا دو۔ ان کے چہرہ پر بھوک کا الارم متواتر بجتا نظر آتا ہے۔

صاحب داد خاں کو ہدایات دے کر اس نے اپنے ساتھیوں کو پکارا

حضرات کرنیل صاحبان، آپ بھی نیچے تشریف لے آئیں۔

جاتے جاتے آپ حضرات سے بھی اپنے ایک قدیم آزاد خاں قسم کے دوست سے ملوا دیں۔

لفٹننٹ کرنل ممتاز نے جواب دیا۔

مگر میری اور آپ کی موجودگی تو وہاں ضروری ہے خواہ برائے نام ہی سہی۔

کرنل نے کچھ کہے بغیر زمرد کا ہاتھ پکڑا اور التجا کی۔

چلیے دو لقمے کھا لیں۔ آنسو بہانے کے ساتھ ساتھ یہ دھندا بھی چلتا رہے۔ تو زندگی دوبھر نہیں ہوتی۔

زمرد کو اشتہا نہ تھی مگر کرنل نعمان کے خیال سے انکار نہ کر سکی اور اُن کے ساتھ چلتی، کھانے کے کمرے میں پہنچیں۔

پھر یہ اس کا معمول ہو گیا، کرنل نعمان اس روتی زمرد کو ہاتھ سے پکڑ کر کھانے کی میز پر لے جاتا اور وہ چلی جاتی۔ اس کی اپنی کوئی خواہش نہ تھی۔ کرنل نعمان، زیادہ سے زیادہ سپاہیوں کی بھرتی کے سلسلہ میں اس سارے راجپوتانے کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ یہ زمرد، اس کی پرسنل سیکرٹری کی حیثیت سے رضاکار عورتوں کی فوجی وردی پہنے۔ ہر جگہ اس کے ساتھ ساتھ جاتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اتنی تبدیلی اس میں آپ ہی آپ پیدا ہو گئی تھی کہ وہ جب تک کرنل کے سامنے بیٹھی بھرتی ہونے والوں کے نام لکھتی، وہ آنسو نہ بہاتی لیکن جب بھی وہ کام سے فرصت پاتی تو پھر منو اس کے تصور پر یوں چھا جاتا جیسے وہ ابھی ابھی اس کو چھوڑ کر گیا ہے۔ اس انوکھے فراق پر وہ اپنا سر بار بار جھٹکتی اور اس وقت اس کی آنکھیں یوں بہتیں جیسے انہیں بہنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں۔ یا پھر ہی چھٹے دن، جب کرنل منو سے متعلق اسے فرضی زبانی پیغام سناتا اور صبر و تحمل کی تلقین کرتا۔ تو زمرد بے اختیار کانپنے لگتی۔ کرنل، نعمان اسے زیادہ سے زیادہ مصروف رکھتا۔ حالانکہ دل

سے وہ اس کی مصروفیت نہ چاہتا تھا، مگر اس کی ہر لمحہ بہتی آنکھوں نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ اسے کسی نہ کسی کام میں لگائے رکھے۔ جن دنوں بھرتی کا کام نہ ہوتا۔ وہ اسے حکم دیتا۔ ٹائپ کی مشین سامنے رکھ کر، ٹائپ کی مشق کرے۔ اس نے مڈل تک۔ تعلیم پائی تھی، انگریزی میں حرف شناسی کی استعداد رکھتی تھی، کرنیل لقمان نے اس کی اس استعداد کو ٹائپ میں استعمال کیا۔

وہ صبح و شام، اسے آدھ آدھ گھنٹے کے لئے، انگریزی کی تعلیم بھی دیتا۔ اس سے خطوط بھی لکھواتا۔

تین مہینے کے وقفہ میں۔ اس نے زمرد کو کسی قدر بدل ڈالا، نہ جانے کیا بات تھی کرنیل لقمان اب اسے گھور گھور کر نہ دیکھتا۔ کبھی کبھی جب اس کی نگاہ اس پر اٹھ جاتی تو وہ ایک عجیب کپکپی کے ساتھ اپنی نگاہیں چرا لیتا۔ اس میں زمرد کی آنکھوں میں دیکھنے کی ہمت خدا جانے کیوں ختم ہوتی جا رہی تھی۔

چھٹا باب

ادھر ایک اور انقلاب منہ زور لادے کی طرح، نزہت بیگم کے دل و دماغ کو اپنے چنگل میں پھنسانے کے لئے زور پکڑ رہا تھا، کرنیل نواز جنگ کی مخالفت کے باوجود، کنور منصور احمد خاں، راجہ شمیم پور کے بڑے صاحبزادے، اپنی بیوی کی رفاقت کے بغیر دہلی میں براجمان تھے۔ رانی صاحبہ بھی قیام فرما تھیں جب سے آئی تھیں جانے کا نام نہیں لیا تھا۔ البتہ بے چاری چھوٹی رانی، آپاجان

کے امدادوں سے شکست کھا کر مہدی پور گئی تھیں۔

بڑی رانی نے تو مستقل چھاؤنی یہیں ڈال لی تھی۔ شمیم پور کے محل کا آدھے سے زیادہ عملہ، یہاں آن پہنچا تھا اور کنور منصور احمد خاں، فرضی سیاسی مصروفیت کے بہانے یہاں ایسے جمے تھے کہ نہ واپس جاتے تھے اور نہ بیوی کو یہاں بلاتے تھے۔ بیوی کے خطوط روزانہ آتے۔ ادھر سے ان کا جواب بھی جاتا مگر ہر خط میں ایک ہی بات لکھی جاتی۔

اپر ہاؤس کی ممبری کوئی مذاق تھوڑی ہے کہ ایسے ہی مل جائے ذرا صبر سے کام لو۔ اس بے چاری کو صبر کی تلقین کرنے والے منصور احمد خاں آپ، انتہائی بے صبری کا شکار تھے۔ وہ صبح و شام کسی نہ کسی بہانہ نزہت بیگم کے ہاں جا پہنچتے ان دنوں نزہت بیگم نے، اپنے حلقۂ احباب کا دائرہ بڑا محدود کر دیا تھا۔ وہ بہت کم لوگوں سے ملتی، لڑکیوں میں نواب زادی سلمیٰ رحمان، اکبری بیگم، رضیہ بیگم سلطان سوراں اور مردوں میں بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں کرنل مسعود، میجر سلیم اور نواب زادہ افتخار کے سوا کوئی اور اس کے ہاں نہ آسکتا اور ان لوگوں کو بھی وہ ہفتہ میں صرف ایک بار مدعو کرتی۔ وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر نہ شراب پیتی نہ قہقہے لگاتی۔ اس حادثہ نے اس نزہت کو قطعاً بدل دیا تھا۔ وہ بالکل الجھ سی گئی تھی پورا ایک مہینہ، وہ یوں بھی بازو کے زخم کی وجہ سے کسی سے ملی نہ تھی۔ مشہور کر دیا گیا تھا کہ وہ برف باری کا تماشہ دیکھنے کے لئے نینی تال کے پہاڑوں پر چلی گئی ہے بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں کے سوا باقی سب کا خیال تھا وہ میجر مسعود کے غم میں پاگل ہو کر، ان پہاڑوں سے سر پھوڑنے کا شغل کر رہی ہے۔ جمّی نے اس خیال کو خوب خوب شہرت دی، اور ہر مجلس میں اس نزہت کی ناکام اور ذلیل قسم کی محبت کا ذکر کر کر کے

خوب قہقہے لگائے۔ اور اپنے ساتھی مردوں کے ساتھ شراب پی پی کر، پہلے سے زیادہ تیز ناچ ناچی، پہلے سے زیادہ دیر دیر تک گھر سے غائب رہی۔ وہ اس نئی سوسائٹی کی صحیح معنوں میں عقل مندہ کن تھی۔ اس نے میجر منو کو اگر کبھی یاد کیا تو شراب کے تین چار پگ پی لینے اور ایک آدھ رقص کے بعد یاد کیا اور وہ بھی اس طرح جیسے وہ کوئی ٹوٹا ہوا جام تھا، جیسے وہ کوئی مرجھایا ہوا پھول تھا۔ جب فوج سے بے ضابطگی کی بنا پر منو کی برخواستگی کی خبر کرنیل مسعود اس محفل میں لے کر آئے۔ تو وہ ہمیشہ سے زیادہ زور سے ہنسی اور اپنا شراب سے بھرا ہوا پیمانہ میجر سلیم کے کوٹ پر اچھالتے ہوئے بولی۔

دیکھو میاں سلیم۔ اگر تم کل کلاں، کسی اور آوارہ چھوکری پر ریجھ کر اسے لے کر کہیں بھاگ گئے۔ تو یہ نہ سمجھنا، میجر منو کی طرح تمہیں ڈس مس کر دیا جائے گا تمہارے خلاف فوجی عدالت میں باقاعدہ مقدمہ چلے گا۔ تمہاری تلاش کی جائیگی، اور جب تک تمہیں برآمد نہ کر لیا جائے گا، فوجی محکمہ چین نہیں لے گا۔

میجر منو کی اور بات تھی، یہ تو بریگیڈیئر آفتاب، احمد خاں، نہ بہت پہلے ارنجمند جانے کے سبب، منو کو غائب کر دینے میں ذاتی مفاد رکھتے تھے۔ اس لئے میجر منو محض ڈس مس ہی کر دئے گئے۔ نہ ان کی تلاش ہوئی اور نہ سمن ایشو ہوئے۔

ساتھیوں نے اس کی کافی لمبی تقریر بڑے مزے سے سن لی، کسی نے بھی لقمہ نہیں دیا، البتہ جب وہ کہہ چکی تو ساتھی شراب کے جام اٹھا کر، پکارے۔

میجر سلیم اور حقیقی بیگم کی جے۔

میجر سلیم نے شرم سے گردن جھکالی، اور بریگیڈیئر آفتاب احمد خان کے خیال

سے اس کے دل پر سانپ لوٹنے لگے۔ وہ بھی نزہت کے طلب گاروں میں سے تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا۔ بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں کی نظر اس نزہت پر ہے۔ اس کا جی چاہا دفتر پہنچ کر فوجی سیلوٹ کئے بغیر بریگیڈیئر صاحب سے پوچھے۔

کیوں حضرت! یہ ہم چھوٹے افسروں کے مال پر آپ کو نظریں جمانے کا کیا حق حاصل ہے۔ آپ چالیس سے اوپر ہو گئے ہیں آپ کو یہ اب بیس پچیس، سال کی چھوکریوں سے عشق کرنا زیب نہیں دیتا۔

مگر بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں کی لمبی لمبی مونچھوں سے اس بے چارے سلیم کو بہت ڈر لگتا تھا۔ ابھی کل ہی بریگیڈیئر صاحب نے اسے اس کے دفتر کے سامنے اچانک روک کر پوچھا تھا۔

یہ تم بہت زیادہ آوارگی کیوں کرنے لگے ہو۔ اور اس نے کانپ کر، پورے فوجی سیلوٹ کے بعد جواب دیا تھا۔

عالی جاہ! میں آئندہ احتیاط کروں گا۔

وہ جانتا تھا کہ اس جواب کے سوا، بریگیڈیئر صاحب کسی اور جواب سے مطمئن نہ ہوں گے۔ بریگیڈیئر صاحب اس کے جسم پر بہت کڑی نگاہ ڈالتے، اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے اور وہ بے چارا کتنی دیر تک سوچتا رہا تھا کہ انہیں کس نے اس قسم کی اطلاع دی۔

اور یہ بات جو اس نے سوچی بہت سنگین تھی۔ وہ آپ ہی آپ سہم سا گیا اور جلدی سے اپنا بھرا ہوا پیگ اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ اور چھمی نے بوتل اٹھا کر، اس کا یہ خالی پیگ بھر دیا۔ اور اس طرح مسکرائی جیسے کہہ رہی ہو۔ جب تک ہم موجود ہیں۔ تمہارا یہ پیگ کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ سچ مچ، چھمی نے میجر منو کے جانے کے بعد

سلیم کو خوب جی کھول کر پلائی تھی۔ اور جب بھی اسے رخصت کیا تھا۔ تو اس کے پاؤں سیدھے نہیں اٹھتے تھے۔

میجر سلیم کو خود سے الجھا کر وہ تھی میجر منّو کو بالکل نظر انداز کر گئی تھی۔ منّو کے ساتھ ساتھ یہ نزہت بھی اس کی نظر سے گر گئی تھی۔ وہ اس کے ہاں اس دن کے بعد نہیں گئی تھی۔ جب سے بائیکاٹ کی تحریک پاس ہوئی تھی۔ حالانکہ نزہت کی مخالفت اس نے محض جل کر کی تھی، اس مخالفت میں منّو کی محبت قطعًا شامل نہ تھی۔ البتہ کبھی کبھی سورن سے مل لیتی اور اسی سے نزہت کے متعلق ایک آدھ سوال کر لیتی۔ سورن نزہت کے ہاں آنے والوں میں سب سے ممتاز تھی۔ اس نے، اس نزہت کو قطعًا نہیں چھوڑا تھا، یہی تو ایک ایسی تھی جس سے نزہت کو دلی وابستگی تھی۔ اس رات کے ہنگامے کے بعد، یہ سورن اس سے اور زیادہ قریب ہو گئی تھی۔ اور گو بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں کے سبب، سورن ہفتہ کی محفل میں شرکت نہ کرتی۔ مگر یوں وہاں روزانہ آتی۔ بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں سے وہ اس رات کے بعد سے سخت ناراض تھی۔ اس کا خیال تھا اگر بریگیڈیئر صاحب، دس دن کی غیر حاضری کے بعد منّو کو ڈس مس نہ کر دیتے۔ اور اس کی گرفتاری کے سمن ایشو نہ کر دیتے تو منّو کبھی یوں غائب نہ ہوتا۔ بے چاری کو معلوم نہ تھا۔ کہ منّو کے فرار اور غائب رہنے کا سبب کچھ اور ہی تھا اور بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں نے منّو کی گرفتاری کا جو سمن ایشو کیا تھا وہ محض اخباری اعلان ہی کی حد تک محدود رہا۔ وہ محض، فوجی بلیٹن اور فوجی اخبار کی زینت بنا۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ بریگیڈیئر صاحب نے نزہت کے اصرار پر، اس سمن کو دفتر ہی میں ہزاروں دوسرے احکام کی طرح

ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا تھا۔ اور عملاً کوئی کارروائی نہ کی تھی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس گرفتاری کے سمن کے سبب، زمرد بیگم پر بہت بڑا اثر پڑا۔ لیکن اس کے سمندر پار کے ایک محاذ پر ایک معمولی مستری کی طرح کام کرنے والے منو کے دماغ کو ایک عجیب اُلجھاؤ میں ڈال دیا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ اس کے خلاف یہ اقدام محض کیوں کافی سمجھا گیا ہے۔ اس کے خلاف نزہت کو زخمی کرنے کے سلسلہ میں کیوں مقدمہ قائم نہیں ہوا۔ بے وقوف نہیں جانتا تھا نزہت نے اس کے لئے کتنا بڑا ایثار کیا تھا۔ کیسی عظیم الشان قربانی کی تھی۔

وہ کرنل نعمان کو اس سلسلہ میں کچھ لکھ نہ سکتا تھا اور نہ کوئی اور ایسی صورت تھی جس سے اس کے اس ذہنی اُلجھاؤ میں کچھ کمی ہوتی۔

مگر وہ بے چارے بریگیڈیئر آفتاب بھی اس کی طرح کچھ نہیں جانتے تھے کہ پچھلے دو مہینہ سے نزہت بیگم کے دل میں کونسی دنیا آباد ہو رہی ہے، اور وہ کس بے خبری کے ساتھ اس خاندان کی طرف جھکی جا رہی ہے جس کا فرد یہ منفرد منو تھا اور جس کی عملاً گرفتاری کو انہوں نے نزہت کے کہنے کے سبب روک دیا تھا۔

بریگیڈیئر آفتاب احمد ہر ہفتہ باقاعدہ یہاں تشریف لاتے اور نزہت کے مزاج میں جو دن بدن زیادہ سنجیدگی اختیار کرتا جا رہا تھا۔ دخل پانے کی بے پناہ کوشش کرتے۔ وہ ہر ہفتے ٹھیک چھ بج کر تیس منٹ پر اس کے ہاں پہنچ جاتے۔ وہ سب سے پہلے آنے والوں میں ہوتے، وہ جب بھی آتے، اپنے ساتھ نزہت کیلئے قیمتی تحائف بھی لاتے۔ نزہت گو مسکرا کر انہیں قبول کر لیتی۔ مگر وہ بریگیڈیئر صاحب کی ہمت افزائی قطعاً نہ کرتی۔ اور اس کا جی ہر بار چاہتا بریگیڈیئر صاحب سے کہے

اعلیٰ حضرت، آپ اپنے دل سے یہ خیال نکال دیجئے کہ یہ تحائف مجھے آپ کی طرف مائل کر سکتے ہیں۔

لیکن وہ یہ تلخ بات کہنے سے محض اس لئے رک جاتی کہ بریگیڈئر صاحب کہیں منّو کی گرفتاری کا سمن، یا قاعدہ جاری نہ کر دیں اور منّو رسوا نہ ہو جائے۔

منّو نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ اس نے اس کے باز دکو گولی مار کر، ایک طرح سے قطعاً بے کار کر دیا تھا۔ اس کے چہرے سے ہنسی چھین لی تھی، اس کے قہقہے آہوں اور نالوں میں بدل دیے تھے۔ اس کے اندر غم کے سمندر کو پرورش کر دیے تھے۔ مگر منّو اس کا سب سے بڑا دوست تھا۔ وہ اسے ایک مرد کی حیثیت سے نہیں ایک ساتھی کی حیثیت سے، ہمیشہ پیار کرتی رہی تھی۔ اس کی محبت مرد کی حیثیت سے نہیں، ایک رفیق، کی حیثیت سے اس کے دل میں پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی، اور وہ یہ قطعاً برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ پھر منّو کو کسی اور پریشانی میں مبتلا ہونا پڑے وہ بے چارا اپنی حماقت کے سبب، پہلے ہی کیا کم مصیبت میں تھا پھر کا اعزاز چھنا، اچھے مستقبل کی اُمید جاتی رہی۔ خاندان نے وراثت سے محروم کر دیا یہ کم سزا تھی جو نزہت بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں کو اپنے دروازے سے دھتکار کر کوئی نیا ہنگامہ کھڑا کرتی۔

البتہ یہ عجیب بات تھی کہ یہ بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں دن بہ دن جتنا زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرتے۔ نزہت اتنا ہی ان سے دور ہٹتی جاتی۔ وہ شروع شروع میں انہیں کافی پسند کرتی تھی لیکن یہ پسند محض انکے ذاتی وقار، ان کی شریفانہ عادات اور اونچے منصب کے سبب تھی۔ مگر اب تو انہوں نے بیٹھے بٹھائے، نزہت کو شکار کرنے کی ٹھان لی تھی۔

نزہت میں شکار ہونے کی گنجائش تو تھیں۔ مگر محض ایک شخص کی، وہ دو

کانٹوں میں اُلجھنے کی ہمت اپنے اندر نہ پاتی تھی۔ کنور منصور احمد خاں نے جو کانٹا، متواتر ڈیڑھ مہینے سے اس کے دل کی ندی میں پھینک رکھا تھا وہ اس میں، عجیب بے چارگی کے ساتھ، بغیر جانے بوجھے پھنستی چلی جا رہی تھی۔ اس نے پہلے دن جب کنور صاحب اس کے ہاں آئے۔ محض اس لئے ان سے التفات کیا تھا کہ وہ منّو کے بھائی تھے۔ پھر اس کی توجہ اس لئے ان سے بڑھی کہ وہ منّو سے متعلق، ان کے گھر کے فیصلے، اس کی موروثی جائیداد سے علیحدگی، اس کے ماہوار وظیفہ کی بندش کے بارے میں، ایسے سمجھائے۔ اور ان کو اس بات پر آمادہ کر گئے کہ وہ اس کی موروثی جائیداد سے علیحدگی کا حکم واپس لے لیں۔ اور بڑی رانی جی سے کہہ کر، اس کے ماہوار وظیفہ پر سے پابندی ہٹا لیں۔

منّو کی نوکری ختم ہونے کے بعد سے اس ماہوار وظیفہ کی کتنی احتیاج ہو سکتی تھی، نزہت اس سے بے خبر نہ تھی۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ منّو کے اخراجات کتنے شاعرانہ تھے۔ میجر کی تنخواہ اور گھر سے ہر مہینہ ملنے والی رقم کے باوجود، وہ لباس کے لئے سورن کا محتاج رہتا اسکے کئی کئی سو کے واجب الادا بل سورن اپنے پاس سے ادا کرتی۔ اور کبھی کبھی، کچھ کم فیاضی سے کام نہ لیتی، وہ بھی چار پانچ سو روپے ماہانہ منّو پر خرچ کر دیتی۔ مگر یہ منصور احمد خاں منّو نہ تھے۔ وہ نزہت کے قریب کیا ہوئے، انہوں نے اسکے احساسات پر اس طرح ہولے ہولے قبضہ کیا کہ تین مہینہ کی مدت ابھی گزر نہ پائی تھی کہ نزہت کو یوں محسوس ہونے لگا کہ اگر منصور احمد خاں اسکے نہ ہوئے۔ تو وہ زندگی کی ایک بڑی ضرورت سے محروم رہے گی۔

یہ بھی عجیب بات تھی کہ اس نے اس پورے وقفہ میں منصور احمد خاں سے کبھی کھل کر بات نہ کی، ان سے کبھی یہ تک نہ کہا کہ جب آپ یہاں نہیں ہوتے، میں

ایسا لگتا ہے کہ پھولوں میں خوشبو نہیں رہی اور کلیاں، مسکرانا بھول گئی ہیں۔

حالانکہ وہ بڑی آزاد خیال لڑکی تھی۔ اس کے قہقہے، اس کی آزادی، اس کی شراب نوشی، اس سوسائٹی میں اپنی شان آپ تھی، جس سے میجر منٹو کے سبب اس نے ایک طرح کی علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اس دن کے بعد، جب منٹو نے اس کے باپ کو زخمی کیا، اس نے شراب کی بوتل پر نگاہ کبھی نہیں کی۔ بریگیڈیئر آفتاب احمد، ڈاکٹر مشتاق احمد۔ اور سورن کے سوا کوئی دوسرا نہیں جانتا تھا کہ اس کے مزاج میں اتنا فرق کیوں آیا ہے، اس کے سارے ساتھی جن میں سے دو تہائی اور اس کے ہاں اب قطعاً نہ آتے۔ اس کی اس خاموشی، اس صوفیانہ روش کو اس کے عشق کی ناکامی پر محمول کرتے۔ مگر یہ تو بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں، سورن اور میجر ڈاکٹر مشتاق احمد کو علم تھا کہ اس روش کا سبب مذہبیت کے اپنے اندر کا انقلاب ہے۔ روح کی وہ بیداری ہے۔ جو کبھی عین جوانی میں وقوع میں آ جاتا ہے اور کبھی عمر گزرنے کے بعد ذہن کے پختہ ہونے کے سبب اپنی صورت دکھاتی ہے۔

سورن کا اپنا ذہن پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے اندر ایک تبدیلی کام کر رہی تھی۔ اور وہ جو ہر لمحہ میجر منٹو کی دم سے بندھے رہنے، اس کے بلوں کی ادائیگی کی خوشی پانے کو حاصل زیست سمجھتی۔ اب مقامی ہسپتالوں، خیراتی اداروں، اور جمنا گھاٹ پر بیٹھنے والے جوگیوں اور دوسرے بے آسرا اور محتاج فقیروں اور فقیرنیوں میں زیادہ وقت صرف کرنے کو شرافت و انسانیت کا چلن سمجھنے لگی تھی۔ وہ یوں تو ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئی تھی مگر آٹھ سال کی عمر سے لے کر اکیس سال کی عمر تک، اس نے اس مذہبیت اور دو سال پیچھے تک سرو جاہت عالم

کے ساتھ اپنا زیادہ وقت گزارا تھا۔ اس کے باپ، جو ایک بہت بڑے سکھ تاجر اور سرو جاہت عالم کی طرح سر تھے۔ دس سال ہی کی عمر میں اس دنیا سے سدھار گئے تھے۔ اس کی ماتا جی، اور بڑے بھائی زندہ تھے۔ اور دونوں کے دونوں نام کے سکھ تھے۔ عملاً ان میں سکھی کا کوئی نشان نہ تھا۔ سورن محض انسان تھی اور اس نئی افتاد نے اس ناکامی نے جو دل کی ناکامی تھی اسے پہلے سے کہیں بہتر انسان بنا دیا تھا۔ اور اس کا جی چاہتا، کسی دن نزہت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہے۔

دیکھ نزہت۔ سکھی! تو اور میں دونوں ایک ہی تیر کی شکار ہیں، آ تو اور میں دونوں آج سے عہد کریں کہ عمر بھر کبھی کوئی ایسا کام نہ کریں گی۔ جس میں ذاتی فلاح۔ جس میں ذات کی بھلائی کی خواہش موجود ہو۔

آ میں اور تو دونوں یہ عہد بھی کریں کہ عمر بھر کنواری رہیں گی۔

مگر اس شام جب باہر ہلکے ہلکے بادل چھائے تھے، اور مارچ کی پہلی تاریخ آجانے کے باوجود، سردی کا زور ابھی ٹوٹا نہ تھا۔ وہ جب یہ اتنی بڑی بات کہنے کے لئے نزہت کے ہاں پہنچی اور حسب دستور بغیر کسی قسم کی دستک دئے وہ اس کے کمرے کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہونے لگی تو بری طرح ٹھٹھک گئی اندر تو ایک عجیب منظر چل رہا تھا۔

نزہت آرام کرسی پہ بیٹھی تھی اور کنور منصور احمد خاں، منو کے بڑے بھائی قالین پر دوزانو بیٹھے، نزہت کے سامنے کی طرف پھیلے خوبصورت ہاتھ میں ایک چمکتی انگوٹھی پہنا رہے تھے۔ سورن کا جی چاہا، دھم سے زمین پر گر پڑے اور زمین پر گری گری چیخے۔

اے نزہت، ہائے۔ میں تجھ سے آج کتنی عجیب اور اونچی بات کہنے آئی تھی اور تو کتنا سفلہ پن کر رہی ہے۔ اری احمق اگر تجھے نکاح ہی کرنا تھا۔ اس منو سے

کیوں نہ کر لیا۔ جو اگر تو اشارہ کرتی تو تیرے قدموں پہ سر رکھ دیتا۔
مگر یہ تو کیا کر رہی ہے۔ یہ کنور منصور احمد خاں تو بڑے ہرجائی ہیں، پہلے اپنی ایک عزیز چھوکری کو کئی مہینے عشق لڑانے کے بعد نکاح کے بندھن میں باندھ چکے ہیں اب تجھے یہ چمکتی انگوٹھی پہنا کر اپنے جال میں پھانس رہے ہیں۔ کل کسی اور کی باری ہو گی۔
اور تو ایسے شخص سے کیسے نباہ کر سکے گی۔

مگر یہ سورن بہت اونچی عورت ہونے کے باوجود محض احمق تھی محض تخیلات کی دنیا میں رہنے والی، محض تصورات کے محل کھڑے کرتی رہتی اگر ایسی نہ ہوتی تو پیرمنّو کیوں اس سے بچ کر نکل جاتا۔ وہ زرد ایسی حسین نہ تھی۔ دہلی کے سب سے بڑے مالدار سکھ کی اکلوتی لڑکی تھی جسے باپ کے چھوٹے ہوئے کئی کروڑ روپے میں سے، ڈیڑھ کروڑ روپے نقد ملے تھے۔ اور یہ رقم ایسی نہ تھی کہ پیرمنّو اس کو پیش نظر رکھ کر اس سورن، سے انکار کرتے، مگر یہ سورن منّو کے بل تو دا کرتی رہی اسکے اچھے لباس بھی سلوانے میں تامل نہ کرتی اگر حجاب ہوتا تو اس میں کہ اس سے کبھی یہ نہ کہتی۔
آؤ منّو ہم تم سول میرج کریں۔

ساتھیوں نے گو اس کی روش دیکھ کر اس پہ طعنے بھی کسے، حتّٰی کہ نزہت تک نے کئی بار اس پر بھری محفل میں چوٹ کی۔

یہ منّو جس سے تو سول میرج کرنے کی سوچ رہی ہے۔ کبھی تجھ سے وفا نہیں کرے گا یہ یاد رکھ لے۔

مگر وہ اس چوٹ کو ہمیشہ پی گئی، پھر منّو سے ایک بار نہیں کہا، پھر منّو دیکھ یہ محض تیری وجہ سے لوگ مجھے طعنے دیتے ہیں۔ آ یہ بات ہی کر دیں، آؤ تو اور میں سول میرج کر لیں۔

ایسی کم گو اور کم زبان تھی یہ سورن۔ کنور منصور احمد خاں اور نزہت کا یہ منظر دیکھ کر جیسی آئی تھی ویسی ہی لوٹ گئی۔

اس رات وہ بے حد بے چین رہی۔ ہر لمحہ اس نے ٹیلیفون کا ریسور اٹھا کر نزہت کو ڈانٹنا چاہا۔ مگر ریسور کو اٹھانے والا اس کا ہاتھ ہر بار کانپ کانپ گیا۔ اور رات اس کی بزدلی پر ہنستی ہنستی بہا گئی گئی۔

ساتواں باب

اور ایسا ہی بزدل وہ کرنیل لقمان تھا جس کے پلے میں یا زیادہ محتاط لفظوں میں جس کی نگرانی میں یہ بے چاری زمرد دے دی گئی تھی۔ اس نے اسے اچھا خاصہ ٹائپسٹ تو بنا دیا تھا۔ اس نے اسے شارٹ ہینڈ کی تھوڑی بہت مشق بھی کرا دی تھی۔ اپنے اثر سے کام لے کر رضا کار عورتوں کے دو امتیازی نشان بھی دلوائے تھے مگر اس کے دل پر چھائے بوجھ کو اچکنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی پورے چار مہینے کے قریب ہر وقت ایک ساتھ رہنے اور اٹھنے بیٹھنے کے باوجود کبھی اس زمرد کی لانبی لانبی قاتل اور انتہائی خوبصورت زرد آنکھوں میں جن کی زردی دن پر دن بڑھتی چلی جا رہی تھی جھانکنے کی کوشش نہ کی تھی جھانکنا تو کہیں رہا اس نے کبھی اس کی آنکھوں سے آنکھیں دو چار نہ کی تھیں یہ ایک عجیب امتحان تھا جس میں اس احمق کرنیل نے اپنے آپ کو ڈال لیا تھا۔

صوبیدار میجر نور محمد کے جتنے خط، اس کے نام آئے تھے ان کا پتہ کاٹ کر اور باہر کا لفافہ، ضائع کر کے اس نے زمرد کو دیئے تھے اور اپنی طرف سے صرف اتنا کہا تھا۔

منّو، اب، اپنی صلاحیت اور قابلیت کے سبب اوپر اٹھنے لگا ہے۔ اس نے چار بہنوں میں ایک تمغہ، اور صوبیدار میجر کا اعزاز حاصل کر لیا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ وہ اگر اسی طرح مستعدی سے کام کرتا رہا۔ تو دو سال کے اندر پھر میجر بن جائے گا۔

زمرد، یہ خط لے لیتی۔ اسے علیحدگی میں آنکھوں سے لگاتی۔ بار بار چومتی۔ اور اس تخیل کے پردہ پردہ راتیں اپنی ہر رنگینی کے ساتھ آن موجود ہوتیں۔ جو زمرد اور منّو نے اکٹھے بسر کی تھیں۔ یہ صرف چند راتیں تھیں۔ چند راتیں۔ مگر زمرد ان راتوں کو اتنا عزیز جانتی تھی کہ ان کی یاد میں ساری عمر بتا سکتی تھی۔ لیکن نہ جانے کبھی کبھی اسے اچانک کیا ہو جاتا۔ وہ دیوانہ وار اپنے بال نوچنے لگتی اور اس کا جی چاہتا۔ وہ اپنا گلا گھونٹ لے۔ وہ خودکشی کرے۔ اس کی وجہ سے، میجر منّو کا مستقبل تباہ ہؤا، خوشیوں بھری زندگی پریشانیوں کی نذر ہوئی، وہ آپ، تو حوادث کا شکار ہونے کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ اس کی اپنی زندگی تو ایسی ہی بدنصیبیوں کی خوگر تھی۔ لیکن یہ منّو اس سے ملنے سے پہلے کس شان و شوکت کے ساتھ رہتا۔ کس ٹھاٹھ کی زندگی گزارتا۔ محض اس سے ملنے سے، اس کی ہر خوشی ختم ہو گئی، اور اسے دیس نکالا لینا پڑا۔

وہ کرنیل لقمان کی بے حد ممنون تھی کہ اس اچھے دل والے شخص کے سبب میجر منّو، کو اپنے جرم کو چھپانے کا موقعہ ملا، اور پھر یہ کرنیل لقمان اس کے اوپر کس قدر مہربان تھا۔ اسے اس طرح سہارا دیئے تھا جیسے وہ اس کی کوئی قریبی عزیزہ تھی۔ وہ اس کی ساری ضروریات کی کفالت کرتا۔ ہر مہینے ہزار روپے یک مشت اس کی تحویل میں دے دیتا۔ اور اس سے ایک دن بھی یہ نہ پوچھتا، وہ یہ روپے کہاں خرچ کرتی ہے۔

کرنیل کی وجہ سے، اسے ہر کوئی احترام کی نظر سے دیکھتا، ہر کوئی، اس کے سامنے ہی

طرح سر جھکانا چاہیے۔ وہ کرنل کی طرح ان کی آقا اور بڑی تھی حالانکہ عہدے کے اعتبار سے وہ محض ایک رضاکار خاتون تھی۔ محض ایک نائب پسٹ گرل تھی۔ ایک پرسنل اسسٹنٹ مگر پورے ایریا کے آفیسرز، لفٹنٹ کرنل، میجر، کپتان۔ اور دوسرے لوگ اسے اپنے سے اونچا سمجھتے۔ اونچا سمجھنے کی بات ہی تھی۔ وہ جانتے تھے۔ کرنل نعمان اس زمرد بیگم سے کتنی عقیدت رکھتا ہے۔ بعض کا تو خیال تھا یہ زمرد بیگم، کرنل کی کوئی ایسی کمزوری ہے جسے وہ کسی چھپی مصلحت کی بنا پر، اس طرح اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور ہے۔ مگر لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تھی کہ کرنل نے، اسے رضاکار عورتوں کے گروپ میں کیوں شامل کیا ہے۔ وہ اس گروپ میں شامل ہوئے بغیر اس کے ساتھ رہ سکتی تھی۔ لیکن یہ تو کرنل ہی جانتا تھا کہ اسکی اس حکمت عملی کا سبب کیا ہے۔

کرنل کے بعض بے تکلف دوست تو اس زمرد بیگم کے سبب، کرنل کی روز مرہ کی زندگی میں آنے والے انقلاب کے سبب، کچھ اور ہی سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے کرنل کو اس زمرد بیگم کے سامنے۔ ایک معمولی خادم کی طرح سر جھکائے کھڑے کئی بار دیکھا تھا، انہوں نے، جب کرنل کے ساتھ کھانا کھایا تھا، چائے پی تھی۔ کرنل اس زمرد بیگم کے پہلو میں میز پر یوں بیٹھا نظر آیا تھا جیسے، اس زمرد بیگم سے ڈر ڈر کر سمٹے کھڑا ہو۔ اس نے اس زمرد بیگم کی وجہ سے شراب پینی بھی کم کر دی تھی پہلے ہر روز جیسے ہی سورج غروب ہوتا۔ کرنل کی میز پر شراب کی بوتل کھل جاتی۔ مگر یہ عادت اب بدلتی جا رہی تھی، اب وہ زمرد کے ڈر کے مارے، اپنی قیام گاہ پر ایک گھونٹ پینے کی جرات نہ کرتا اور اگر کبھی باہر سے پی کر آتا۔ تو زمرد کے سامنے جانے سے یوں ڈرتا جیسے یہ اسکی ماں تھی۔ اور ایک رات جب، آسمان پر گھنے بادل چھائے تھے۔

در بوندا باندی ہو رہی تھی۔ وہ لفٹننٹ کرنیل ممتاز خاں اور میجر مسعود کے ساتھ، کرنیل برنہار
کی قیام گاہ سے خوب مدہوش ہو کر لوٹا، رستہ میں اس کی طبیعت سخت خراب ہو گئی۔ کرنیل برٹ
ہارٹ کی چھاؤنی سے کرنیل لقمان کا ڈاک بنگلہ چودہ میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ پورا رستہ وہ
لفٹنٹ کرنیل ممتاز کا ہاتھ اپنے دل پر رکھ کر بچوں کی سی بے صبری کے ساتھ کہتا رہا۔

نہ جانے ممتاز میں صبح زندہ بھی بچوں گا یا نہیں۔ میں صبح، زمرد کی صورت
بھی دیکھ سکوں گا یا نہیں۔

اس وقت لفٹنٹ کرنیل ممتاز پر یہ راز کھلا کہ کرنیل لقمان زمرد بیگم سے
کتنی سخت محبت کرتا ہے۔

ڈاک بنگلہ پر آتے آتے، اس کی طبیعت پہلے سے بھی خراب ہو گئی اور جب
وہ ڈاکٹر ممتاز اور میجر مسعود کی مدد سے، اپنے کمرہ میں لایا گیا، تو اس نے اپنے معمول
کے خلاف ممتاز سے قریب روتی ہوئی آواز میں درخواست کی۔

ممتاز تم ڈاکٹر ہو اور میں جانتا ہوں ڈاکٹر بڑے بے رحم ہوتے ہیں لیکن اگر
تم کسی طرح زمرد سے کہہ سکو، کہ وہ مجھے ایک دفعہ اپنی صورت دکھا دے۔"

وہ زار زار رونے لگا۔

ڈاکٹر میں کہتا ہوں، میں آج رات ضرور مر جاؤں گا۔ آج رات کے بعد
میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔

لفٹنٹ کرنیل ممتاز نے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اس کے دل کا معائنہ کر لیا تھا
اسنے اسکی حالت اچھی طرح دیکھ لی تھی اور اسے یقین تھا کہ یہ محض بحرانی کیفیت ہے یہ
محض شراب کے اثراتِ بد ہیں جو عشق کی گرمی سے مل کر یہ صورت اختیار کر گئے ہیں۔"

اس میں کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ لیکن وہ اپنے اس دوست کی اس خواہش کو رد نہیں کر سکا اور زمرد بیگم کے کمرے پر پہنچ کر دستک دی۔ زمرد رات کو بہت کم سونے کی عادی تھی اور آج تو بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک نے اُسے کتنی دیر سے بے چین و مضطرب رکھا تھا۔ وہ میجر منو کی یاد میں آنسو بہا بہا کر یہ بوجھل وقت کاٹ رہی تھی۔

دستک پر اُس نے دروازہ کھولا، اور پوچھا کون۔

جو اب میں ممتاز کی آواز پہچان کر، اُس نے پوچھا۔

کیوں ڈاکٹر صاحب خیر تو ہے۔

ممتاز نے کرنیل لقمان کی علالت اور اس کی خواہش سے آگاہ کر دیا۔ اور وہ کچھ اور کہے بغیر اسی طرح کرنیل لقمان کے کمرے کی طرف لپکی، جیسے، ممتاز نے اس کے اکلوتے بچے کی خوفناک علالت کی خبر دی تھی۔

اس نے میجر مسعود سے کوئی حجاب نہیں کیا اور اس کے سامنے، کرنیل لقمان کے سرہانے بیٹھ کر اسکی پیشانی پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

کیوں کرنیل صاحب! یہ اچانک آپ کیا روگ لگا لائے،

کرنیل نے کوئی جواب نہیں دیا، بچوں کی طرح رونے لگا۔ زمرد بیتاب ہو گئی، وہ کرنیل لقمان کی روتی آنکھوں سے آنسو پونچھتی جاتی اور اسکے ساتھ ساتھ آپ بھی روتی جاتی۔ اور یہ منظر دیکھ کر، کرنیل ممتاز آپ ہی آپ باہر نکل گیا مسعود پہلے ہی باہر کھڑا تھا، اس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔

اچھا کیا تم اندر نہیں رکے۔ کرنیل لقمان، اصل میں اس عورت کے عشق کو اندر ہی اندر دبائے تھے، آج یہ دبی ہوئی آگ اچانک زیادہ شراب پینے سے چمک اُٹھی ہے۔

یہ کہہ کر اس نے میجر مسعود کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتا ہُوا اپنے کمرے میں لے گیا۔ اور ٹھنڈی آہ بھر کر کہنے لگا۔

دوست! یہ عشق بھی کیا چیز ہے، موقعہ محل، جگہ بے جگہ کچھ نہیں دیکھتا کرنیل بے چارے کو ایسی عورت سے عشق ہُوا ہے جو کسی دوسرے کی ہے۔ اور اتنے اونچے کیریکٹر کی ہے کہ کرنیل اپنے دل کی بات اس سے کہتا شرماتا ہے۔

یہ بالکل سچ بات تھی کرنیل لقمان کی سب سے بڑی مصیبت یہی تھی، منّو اس کا بہت پیارا دوست تھا اور گو لندن کے دوران قیام میں ان دونوں نے کئی بار مشترکہ عارضی محبت کی تھی۔ وقتی طور پر، ایک ہی لڑکی کو اپنی جنسی خواہش کا مرکز بنایا تھا۔ مگر، یہ تو قصہ ہی اور تھا۔ کرنیل کو معلوم تھا منّو نے اس لڑکی کی خاطر کتنے بڑے عذاب مول لئے تھے۔ کیسی کیسی رسوائیاں سہی تھیں۔ مگر اس علم کے باوجود کرنیل، آپ ہی آپ اس لڑکی کی طرف طرح کھینچا چلا جا رہا تھا جیسے، لوہا مقناطیس کی طرف کھینچتا ہے

اور آج تو، اس کے ضبط کی طنابیں، کھنچ کر ٹوٹ گئی تھیں گو اس نے ابھی تک زمرد بیگم سے، اپنے دل کے اضطراب سے متعلق ایک حرف نہیں کہا تھا لیکن بچوں کی طرح روتے ہوئے اس نے کئی بار، زمرد کے نازک نازک ہاتھ کو اپنے ڈوبتے دل پر رکھ کر التجا کی تھیں۔

ہائے اس ڈوبنے سے بچا لو۔

زمرد انا بینا ہونے کے باوجود کچھ نہیں سمجھتی تھی، اسے کرنیل کے ساتھ دن رات رہتے پانچ مہینے ہونے کو آئے تھے، اس پوری مدت میں، ایک بار بھی تو کرنیل نے ایسی حرکت نہ کی تھی جس سے زمرد کو اسکے دلی اضطراب کا پتہ چلتا، یا وہ کوئی شبہ اپنے دل میں پال سکتی۔ وہ بے وقوف، آپ، اس کی پریشانی اور اضطراب کے

کے سبب رو رہی تھی اس کی خوبصورت آنکھیں آپ ساون بھادوں کی طرح برس رہی تھیں۔ اس کا جی چاہا، بھاگتی ہوئی باہر جائے اور ڈاکٹر ممتاز سے ڈانٹ کر پوچھے۔

ڈاکٹر یہ تم محض بھرتی کے گدھوں کو ٹونٹی لگانے کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔ یہ تم کرنل صاحب کی بے چینی دور نہیں کر سکتے۔

مگر جیسے ہی وہ اس ارادہ سے اُٹھتی۔ کرنل، بُری طرح تڑپ کر، اسے روک لیتے اور انتہائی درد بھرے انداز میں کہا۔

نہیں زمرد تم ایک لمحہ کے لئے میرے سامنے سے نہ ہٹو۔ تم ایک لمحہ کے لئے اپنا ہاتھ میرے دل پر سے نہ ہٹاؤ۔ ورنہ میں مر جاؤں گا۔

اور وہ بے چاری ڈر اور کانپ کر، پھر بیٹھ جاتی اور اپنا کانپتا ہاتھ کرنل کے دل پر رکھ دیتی۔ یہ ایک عجیب ابتلا تھا جس میں وہ مبتلا کر دی گئی تھی۔ خود کرنل بھی کسی کم عذاب میں مبتلا نہ تھا۔ اس کے اندر ہزاروں دوزخ جل اُٹھے تھے۔ اور شراب میں ہزار عیب سہی، اس ظالم میں ایک بڑی خوبی ہے کہ ہزاروں دوزخوں کے جلنے کے باوجود وہ نہ جانے کہاں سے نیند کی پریوں کو ہانک لاتی ہے اور شرابی کے ہر کرب و ابتلا کو، یہ پریاں یوں اپنے پروں میں چھپا لیتی ہیں۔ جیسے مرغی اپنے ڈر سے اور سہمے ہوئے چوزوں کو۔

نیند کی یہ پریاں شرابی، لقمان پر بھی مہربان ہو گئی تھیں اور وہ، زمرد کا ہاتھ اپنے دل پر رکھے رکھے اسی طرح گہری نیند سو گیا تھا۔ جیسے صحت مند بچہ، اپنی ماں کا دودھ پیٹ بھر کر پی لینے کے بعد سو جاتا ہے۔

زمرد کی روتی آنکھیں بہنے سے رُک گئی تھیں۔ مگر ابھی تک، اس کا ہاتھ کرنل کے دل پر

رکھا تھا ابھی تک اس نے اپنا ہاتھ اس ڈر سے وہاں سے نہ ہٹایا تھا کہ کرنیل پھر جاگ نہ اٹھے وہ کرنیل کے احسانوں کے بوجھ تلے دبی تھی۔ اس میں تو اتنی سکت تھی کہ وہ کرنیل کے لیے رات بھر ایک پاؤں کے بل کھڑی رہ سکتی تھی۔ اور یہ رات بھی اس نے اسی طرح کرنیل کے سرہانے زمین پر دو زانو بیٹھے بیٹھے بتا دی۔ اسکی آنکھ ایک لمحہ کے لیے بھی نہ جھپکی ایک لمحہ کے لیے بھی تو اس پر نیند غالب نہیں آئی۔ اور رات بھر اس کے سرہانے بیٹھی بیٹھی عورتوں کی طرح سوچتی رہی۔ اگر سچ مچ کرنیل صاحب مر گئے تو اس کا کیا بنے گا۔

اور اس کرنیل نے صبح سورج چڑھے جب آنکھ کھولی اور زمرد کو اس طرح دو زانو فرش پہ سرہانے بیٹھے اور ہاتھ اپنے دل پر رکھے پایا۔ تو اسے ایسا لگا جیسے زلزلہ پھر سے لہرا گیا ہو۔ اور زلزلے کے ان جھٹکوں میں اسے رات کی باتیں بھی یاد آگئیں وہ شرابی یقیناً تھا، مگر۔ اس کے کردار میں پختگی تھی۔ ایک بڑائی تھی وہ اس بڑائی کو کسی قیمت پر بھی مجروح کرنا نہ چاہتا تھا جبکہ اسے اچھی طرح علم تھا کہ زمرد منو سے ایسی محبت کرتی ہے جسے کسی طرح بھی دھندلا نہیں کیا جا سکتا۔

یہ باتیں اسے جیسے ہی یاد آئیں، اسے کچھ ایسا خیال ہوا جیسے اس نے نشہ کے عالم میں زمرد سے کوئی وہ بات کہہ دی ہے جو اسے کہنی نہ چاہیئے تھی۔ اس نے کانپتے کانپتے دل سے چاہا۔ اسے کاش زمرد یہاں سے اٹھ جائے۔

زمرد احسان شناس تھی۔ اس کے دل میں نیکی کے سوا اور کچھ نہ تھا، اس نے کرنیل صاحب کو جاگتے دیکھا تو اس طرح مسکرائی جیسے کلیاں ہر صبح سورج کا منہ دیکھ کر مسکرا دیتی ہیں۔ اور پھر بہت میٹھی آواز میں پوچھا۔

اب تو آپ کو کوئی تکلیف نہیں، اب تو دل میں درد نہیں ہو رہا، اب تو آپ

میرے چلے جانے سے مرنے کا اندیشہ نہیں پاتے۔

کرنیل کا دل پہلے سے زیادہ دھک دھک کرنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس نے رات امراؤ کے سوا کوئی اور بات بھی کہہ دی ہے۔ اس نے گھبرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور منہ دوسری طرف پھیرے پھیرے التجا کی۔

آپ اپنے کمرے میں چلی جائیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کوئی تکلیف نہیں۔

زمرد اپنی جگہ سے اٹھی، کمرے میں نگاہ دوڑائی، اور باہر آئی، باہر برآمدہ میں میجر مسعود، دو بیروں کو زمین پر بٹھائے، اپنی ٹانگوں کو دبوا رہا تھا۔ زمرد کو اس عالم میں، سلیپنگ گون پہنے جس کے اوپر کے بٹن کھلے تھے، باہر آتے اور پاس سے گزرتے دیکھا تو شرما کر آنکھیں تو جھکا لیں، لیکن دل میں عجیب عجیب سوے جاگ اٹھے وہ سوچنے لگا۔ یہ رات بھر وہیں رہی ہے کرنیل صاحب نے اسے اب تک اپنے کمرے میں جانے نہیں دیا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا، زمرد کس عالم میں وہاں رہی۔ اور کرنیل کے دل و دماغ پر اس وقت کیا بیت رہی تھی جب یہ زمرد اسے چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ اپنے پلنگ پر نیم پاگلوں کی طرح بیٹھا، ٹک ٹک سامنے کی دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا، ابھی یہاں سے اٹھے، اور کسی ایسی جگہ بھاگ جائے جہاں سے کوئی اسے ڈھونڈ نہ سکے۔

اسے اس زمرد سے یقیناً انتہائی محبت تھی، لیکن اسکی محبت رسوائی اور ذلت بخش اعلان کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب میجر مسعود، صبح کا سلام کرنے اس کے پاس آیا تو اس کی آنکھیں گنگا جیسی روانی سے بہہ رہی تھیں۔ میجر کو دیکھتے ہی اس نے اپنا منہ چھپا لیا۔ اور آنکھیں پونچھ لینے کے بعد اپنا منہ باہر نکال کر بچوں کیسے اضطراب کے ساتھ پوچھا۔

کیا لفٹننٹ کرنل ممتاز ابھی نہیں آئے۔

میجر نے ممتاز کے اٹھنے کی خبر دی تو اس نے اسے حکم دیا۔

مہربانی فرماکر انہیں میرے پاس بھیج دیں۔ اور میری اردلی کے ڈرائیور سے کہیں۔ جیپ گیرج سے باہر نکال لائے۔ میں ابھی سفر پر جا رہا ہوں۔

میجر کہنے کو تھا۔

لیکن نو بجے تو آپ کو یہاں کے رکروٹنگ آفس کا معائنہ کرنا تھا۔

کرنل صاحب کے انداز سے وہ کچھ بہت مرعوب سا ہو گیا تھا، سلام کرتا ہوا باہر آیا۔ اور لفٹننٹ کرنل ممتاز کے پاس پہنچ کر یہ ساری کیفیت کہہ دی، ممتاز، کرنل کی حالت سے زیادہ باخبر تھا۔ کرنل کے ضمیر اور کردار کی گہرائیوں سے بھی ناآشنا نہ تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اور تولیہ کندھے پر سے اٹھا کر سٹینڈ پر رکھتے ہوئے، کرنل کے کمرے کی راہ لی۔

کرنل لباس تبدیل کر چکا تھا۔ اور اپنے اٹیچی بیگ میں۔ کچھ کاغذات رکھنے میں مصروف تھا جب ممتاز نے اندر قدم رکھا! ممتاز کو دیکھ کر اس نے اٹیچی کیس بند کیا۔ اور بڑی صاف آواز میں کہنے لگا۔

میں ذرا بھوپال تک جا رہا ہوں، شاید رات کو لوٹ نہ سکوں، میں نے میجر مسعود اور آپ کو آج کے معائنہ کے احکام دیدیئے ہیں۔ آپ دونوں معائنہ کر لیں۔

کل کا دن۔ یوں بھی خالی ہے پرسوں تک میں مزید احکام آپ کے نام بھیج دونگا۔

ممتاز نے حیرت سے پوچھا۔

لیکن یہ اچانک تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی۔

کرنیل تھے۔ پورا چہرہ اوپر کی طرف اٹھا کر ممتاز کو یوں دیکھا۔ جیسے وہ عموماً معائنہ کے وقت نئے رنگروٹوں کو دیکھنے کا عادی تھا۔ ممتاز گو رینک کے اعتبار سے لفٹنٹ کرنیل تھا۔ لیکن منصب کے اعتبار سے۔ کرنیل سے بہت جونیر تھا۔ کرنیل اس سارے ریکروٹنگ ایریئے کا نہ صرف انچارج تھا۔ بلکہ اس کی کارگزاری بڑے بڑے تیس مارخاں جرنیلوں سے کہیں زیادہ تھی اس نے پچھلے ایک سال میں جب سے جرمنوں کے خلاف انگریزوں نے ہتھیار اٹھائے تھے ایک لاکھ سپاہی بھرتی کئے تھے اور یہ ریکارڈ اتنا شاندار تھا کہ اس کی مثال کسی دوسرے ریکروٹنگ ایریئے نے پیش نہیں کی تھی۔

ممتاز نے، ادب سے سر جھکا لیا۔ اور پھر کچھ نہیں پوچھا۔ کرنیل نے اپنی کیس اوپر اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ سے ڈریسنگ ٹیبل پر سے کچھ کاغذات اٹھا کر ممتاز کی طرف بڑھائے۔ اور باہر کو قدم اٹھاتے ہوئے عجیب سے رخی سے کہا۔

اچھا خدا حافظ۔

لفٹنٹ کرنیل ممتاز کو اس کے مزاج شناس ہونے کے باوجود ایسا لگا جیسے وہ اس کرنیل سے قطعاً ناواقف تھا یا جیسے اس کی ملاقات اس سے آج ہی ہوئی تھی۔

باہر برآمدہ میں پہنچ کر اس نے زمرد کے کمرے پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔ اس کا دل کسی قدر لرزا۔ پاؤں کسی قدر ڈگمگائے۔ آنکھیں کسی قدر جھپکیں۔ لیکن اس نے فوراً سر جھکا لیا باہر کھڑی جیپ کے قریب پہنچا۔ اور چاروں طرف کھڑے ماتحت عملہ کی طرف دیکھے بغیر جیپ میں کود اور ڈرائیور کو پوری تلخی کے ساتھ حکم دیا۔

بھوپال کی طرف چلو۔

قریب کھڑے ماتحت عملے نے زور سے پاؤں کھڑکائے، اپنے ہاتھ پیشانیوں پہ لے گئے۔ مگر اس نے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور جیپ گاڑی ڈاک بنگلہ کے احاطے سے نکل کر بھوپال کو جانے والی سڑک پر بھاگنے لگی۔

ڈاک بنگلہ میں کھڑے ماتحت عملے کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ گو بہت بڑا افسر تھا، مگر اس نے کبھی اس طرح ان کے ساتھ سلوک نہ کیا تھا۔ کبھی ان کے سیلوٹ کی یوں بے حرمتی نہ کی تھی۔ یہ تو فوجی آئین کے بھی خلاف تھا اور اخلاق کے بھی منافی۔ وہ تو خیر اور رینک کے لوگ تھے میجر مسعود، کیپٹن نعیم، لفٹنٹ جھنڈا یہ تو افسر تھے۔ کرنیل نے ان کے سلام قبول نہیں کیے تھے۔ حالانکہ کرنیل ایک معمولی اردلی کے سلام کو اس طرح ہنس کر قبول کرنے کا عادی تھا۔ جیسے یہ اردلی اس کا رفیق اور ساتھی تھا۔

اور جس کے سبب یہ ساری روئداد مرتب ہو رہی تھی وہ اپنے پلنگ پر اوندھے منہ پڑی گہری نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ رات بھر جاگنے کے سبب، نیند نے اس پر پورا غلبہ پا لیا تھا۔

کوئی ایک بجے کے قریب مس میری نئی ٹائپسٹ گرل نے ہولے ہولے قدم اٹھاتے اس کے دروازہ کا رخ کیا، دروازہ پر ہلکی ہلکی دستک دی۔ زمرد جاگ اٹھی، سامنے کی میز پر رکھی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ اور اس طرح ہڑبڑا کر اٹھی جیسے کوئی بڑی غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ آج اس کے سارے معمول میں فرق پڑ گیا تھا۔ نہ اس نے کرنیل صاحب کے لیے چائے بنائی نہ ان کے کپڑے نکالے نہ ان کے کاغذات درست کیے۔ اور نہ ان کی ڈائری کی خانہ پری کی۔

یہ بوجھل خیال دل پر نازل کئے وہ دروازے کے قریب آئی دروازہ کھولا
اور مس میری کو دروازہ پر کھڑے پاکر پہلا سوال کیا
کیا کرنیل صاحب آج معائنہ کے لیے تشریف نہیں لے گئے۔
مس میری نے ذرا اندر کی طرف آتے ہوئے سرگوشی میں جواب دیا۔
کرنیل صاحب تو بھوپال تشریف لے گئے ہیں اور اس طرح گئے ہیں کہ اسٹاف
کا نہ سلام قبول کیا اور نہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔
نہ جانے کرنیل صاحب کو یہ اچانک سوتے سے اٹھتے ہی کیا ہو گیا۔
زمرد کو ایسے لگا جیسے آسمان پھٹ پڑا۔ اس کا سارا جسم بید مجنوں کی طرح
کانپنے لگا اور کسی غیر مرئی قوت نے بہت اوپر پھیلی فضا سے اسے آواز دی۔
پگلی اس رات کرنیل صاحب پر جو بحران طاری تھا، یہ جو وہ بار بار تیرا ہاتھ
اپنے دل پر رکھ لیتے یہ جو ان کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برستیں یہ جو وہ
تجھ سے بار بار کہتے زمرد یہاں تو اس فرار کی تمہید تھی۔ یہ وہ
دھواں تھا۔
جو کرنیل صاحب کے دل کی کائنات جل جانے کا ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا۔
مگر تو احمق کچھ بھی نہ سمجھی! اور زمرد نے ڈوبے ڈوبے دل کے ساتھ سوچا۔
یہ کرنیل صاحب نے اس بدنصیب سے دل کیوں لگایا۔ کیا اسکے سوا اس
بھری دنیا میں انہیں کوئی دوسری عورت نہ ملی تھی۔ وہ تو آپ محبت کے ایک کھلونا
لادسے کے دہلانے پر کمربستہ تھی۔ وہ تو آپ ایک ایسے دوزخ میں مبتلا تھی جس سے
نجات کبھی ممکن نہیں ہو سکتی۔

مس میری نے زمرد کے جسم کو کانپتے اور اس کے چہرے کی رنگت کو سفید پڑتے دیکھ کر وہی بات محسوس کی جو اس دماغ کی عورت کو محسوس کرنا چاہیئے تھی اس نے سوچا۔ اس لڑکی کی کسی حرکت سے کرنیل صاحب کی خدمت میں کوئی گستاخی کر دی ہے جو کرنیل صاحب یوں غصّہ کے گھوڑے پر سوار تھے مس میری کا جی چاہا، اس زمرد بیگم سے کہے۔

زمرد، میں اینگلو انڈین لڑکی ہوں۔ میرا رنگ تیرے رنگ سے صاف میرا جسم تیرے جسم سے قومی اور میری جوانی تیری جوانی سے کہیں اونچی ہے اگر کرنیل صاحب جیسا بڑا افسر میرے جسم کو ننگا کر کے اس پر بید برسانے کی بھی خواہش کرتا تو میں انکار نہ کرتی۔

لیکن تو بڑی ناشکری ہے۔

مگر یہ بات وہ کہہ نہ سکتی تھی اسے علم تھا۔ اس زمرد بیگم کے ہاتھ میں اس کرنیل صاحب کی لگام ہے۔ اور وہ آج اس سے رُوٹھے ہیں تو کل کیا خبر اس سے پھر من جائیں۔ زمرد جس عالم میں کھڑی تھی اسی عالم میں پلنگ پر آئی اور پھر پلنگ پر اوندھے مُنہ گر کر جو روئی تو اس اینگلو انڈین لڑکی کی رائے بھی بدل گئی اور آنکھیں بھی بھر نکلیں۔

تھوڑی دیر بعد جب لفٹنٹ کرنیل ممتاز دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر آئے تو زمرد پہلے ہی کی طرح اوندھے مُنہ گری پڑی رو رہی تھی مس میری کے ہاتھ، اس کے سر پر رکھے تھے اور وہ اس سے روندھے ہوئے گلے سے کہہ رہی تھی۔

زمرد بیگم! زیادہ نہ رو دیئے۔ رونے سے کچھ نہیں بنے گا۔

ممتاز نے سوچا، سچ مچ رونے سے کبھی کچھ نہیں بنا۔ زمرد کے یہ آنسو، کرنیل صاحب کو واپس نہیں لاسکتے۔ کرنیل صاحب نے، تو ابھی آدھ گھنٹہ پہلے، اسے راستے کے ایک ملٹری کلب سے فون کیا تھا۔ کہ ان کا ذاتی سامان آج ہی ڈاک گاڑی سے دہلی بھیج دیا جائے۔ وہ آج شام بھوپال سے دہلی فلائی کر جائیں گے اور پھر یہاں آنے کی بجائے نارتھ ویسٹرن ایریا کا چارج لینے کے لیے راولپنڈی چلے جائیں گے۔

انہوں نے تو اس سے یہ بھی کہا تھا، اس ایریا میں ان کا کام قریب قریب ختم ہو چکا ہے اور جنرل ہیڈکوارٹر کا خیال ہے کہ میری ضرورت اب یہاں نہیں رہی۔ مجھے نارتھ ویسٹرن ایریا کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

انہوں نے اتنی ساری باتیں تو اس سے کہہ دی تھیں۔ مگر زمرد بیگم کے بارے میں ایک حرف نہیں کہا تھا البتہ عام اسٹاف کے متعلق ہدایات دی تھیں کہ ایسی کسی قسم کی تبدیلی اس وقت تک نہ کی جائے جب تک جنرل ہیڈکوارٹر سے کسی نئے آدمی کا تقرر نہ ہو۔

یہ خبر وہ اس زمرد سے کہنے آیا تھا، وہ ڈر رہا تھا کہ زمرد نے اگر اس سے پوچھا کرنیل صاحب نے میرے بارے میں کیا کہا، تو وہ کیا جواب دے گا مگر یہاں پہنچ کر اس نے زمرد بیگم کو اس خطرناک انداز میں روتے دیکھا، اسکی سسکیوں کی آواز سنی، تو اس کا دل دہل گیا اور اسے خیال ہوا۔

کرنیل صاحب اور اس میں کوئی فیصلہ کن بات ہو گئی ہے کرنیل صاحب نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس سے اپنے عشق کی روئداد کہہ دی ہے اس نے ان کی اس روئداد کو سن کر، ان کے منہ پر تھوک دیا ہے یہ سارا ہنگامہ، یہ ساری قیامتیں صرف اسی لئے اٹھی ہیں۔ اور اب یہ زمرد اس لیے رو رہی ہے کہ

اس کا کیا ہوگا۔ اس نے یہ بات کرکے، اپنے مستقبل کو خواب کر لیا ہے۔ اور شاید اس سے، اس کے محبوب کے اوپر کوئی بڑا اثر پڑے۔

آخری ہی خدشہ قرین قیاس تھا، زمرد کے لیے یہ آخری بات ہی زیادہ تشویش ناک تھی اس لیے لفٹنٹ کرنیل ممتاز نے زمرد کے دل کو ڈھارس بندھانے کے لیئے اس کے بہت قریب آکر مس میری کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور پھر، اس کے کان میں کہا۔

تم یہ اطمینان رکھو، کرنیل صاحب اتنے نیچ نہیں ہیں کہ تم سے نا امید ہوکر وہ میجر منّو سے اس کا بدلہ لیں گے۔

منّو ان کا بہت گہرا دوست تھا اور وہ اب بھی اس سے پہلے ایسی محبت رکھتے ہیں۔ عشق نے ان کے باہمی تعلق پر کوئی بڑا اثر نہیں ڈالا ہے!

زمرد کی سسکیاں رک گئیں، اس کا سر اوپر اٹھ گیا اور اس نے اس ممتاز کو اس طرح دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو۔

یہ تم سے کس احمق نے کہا۔ میں اس لئے رو رہی تھی کہ کرنیل صاحب میجر منّو سے کوئی بدلہ لیں گے۔ بدلہ لینے کی بات ہی نہیں۔ کرنیل صاحب نے کوئی ایسا ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ اور نہ مجھے اس کا اندیشہ ہے۔

میری مصیبت تو یہ ہے کہ کرنیل صاحب کے دل کی آگ ٹھنڈا کرنے پر قدرت نہیں رکھتی۔ اپنی مجبوری کے سبب، منّو کی جلا وطنی، اس کی قربانیوں، اور اس کی غیر فانی محبت کی وجہ سے۔ میں، منّو کے سوا کسی دوسرے مرد کا تصوّر تک نہیں کر سکتی۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو کرنیل صاحب، اگر مجھے آگ میں کود جانے کو کہتے، تو

میں ابراہیم کی طرح اس میں بلا تامل کود پڑتی۔

آپ یہ بھی طرح محسوس نہیں کر سکتے۔ میرے دل میں کرنل صاحب کی کتنی عزت ہے۔ میں انہیں کتنا محترم جانتی ہوں۔

اس نے ممتاز سے یہ کچھ تو نہ کہا۔ کہا تو صرف اتنا۔

ڈاکٹر صاحب میں بڑی بدنصیب ہوں، اور بڑی ہی پست ہوں۔ میرے سبب کرنل صاحب کو اس درجہ ذہنی دکھ پہنچا۔

ممتاز موڈ میں نہ تھا اور نہ کہتا۔

زمرد بیگم یہ دکھ نہیں یہ تو ہزار راحتوں کی ایک راحت ہے یہ تو عشق ہے۔ اس میں رونے، بلکنے، اور تڑپنے میں جو لذت ملتی ہے۔ ایسی لذت تو ہزار مسکراہٹوں ہزار قہقہوں میں نہیں ہوتی۔

یہ مزہ تو کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

اس نے کچھ کہے بغیر، زمرد کی طرف دیکھا، اس کی رنگت ایک ہی رات میں کتنی پیلی پڑ گئی تھی لانبی لانبی قاتل آنکھوں کی زردی کس قدر بڑھ گئی تھی اور آنکھوں کے گردیوں حلقے پڑ گئے تھے جیسے وہ برسوں کی مریض تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ زمرد بھی کرنل صاحب سے کردار میں کوئی کم حیثیت کی عورت نہیں۔ یہ بھی پہاڑوں سے سر پھوڑنے کا عزم رکھتی ہے۔ یہ بھی دریاؤں کی روانی کا مقابلہ کرنے پر قادر ہے۔ کرنل صاحب نے اس سے عشق کر کے سچ مچ کوئی اچھا سودا نہیں کیا اور اس کا جی چاہا۔ وہ اس عورت کے سامنے اپنا سر جھکا دے اور کہے۔

میں تجھے [illegible] کرتا ہوں۔ کہ میں معجز منو کے آ [illegible] اس طرح

خدمت کروں گا، جیسے ایک بھائی اپنی بہن کی خدمت کرتا ہے۔ جیسے ایک بیٹا اپنی ماں کی یا ایک باپ اپنی بیٹی کی۔

اس نے اپنے دل کی یہ خواہش مان لی۔ اور زمرد کے سامنے اس طرح جھک گیا جیسے کرنیل لقمان اس دن جھکا تھا جب پہلے دن زمرد کو دیکھا تھا نہ جانے کیسے زمرد کے حافظہ پر اس ملاقات کی وہ گھڑی چھن چھن کرتی نازل ہوگئی۔ اور وہ غریب سوچنے لگی کیا یہ رکوع کسی نئے باب کی تمہید تو نہیں، کیا یہ کوئی نئی داستان نئے قلم سے تو نہیں لکھی جا رہی۔

یہ داستان پہلی داستان سے قطعاً مختلف تھی لفٹنٹ کرنیل ممتاز۔ نہ متو تھا نہ لقمان، اس میں تو ان دونوں جیسی بات نہ تھی۔ یہ نہ زمرد کے سامنے عجز محسوس کرتا۔ نہ اسکے حسن کو غیر فانی اور اس کی رعنائیوں کو ملکوتی سمجھتا اس نے کبھی ان رعنائیوں پر توجہ ہی نہیں دی۔ جیسے باپ گھر میں آتا ہے۔ اور جوان بیٹی کو حکم دیتا ہے۔ میرے کپڑے لاؤ۔ میرے لئے پانی گرم کرو، غسل خانہ میں تولیہ رکھ دو، دیکھو تم نے۔ میرا کوٹ خراب کر دیا، تم نے درزی کو شائد ٹھیک ہدایات نہیں دی۔ یہی طریق کار ممتاز کا تھا۔

زمرد اس کے ساتھ کام پر یقیناً جاتی۔ مگر وہ وہاں اس سے زیادہ کام نہ لیتا۔ زیادہ کام مس میری کرتی۔ شائد۔ مس میری کو اس کی جنسی نگاہ نے انتخاب کر لیا تھا۔ یہ بہر حال مس میری، دفتر کے ہر کام پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ اور زمرد کے ذمہ گھر کی دیکھ بھال تھی۔ ممتاز نے کبھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھینپنے کی ضرورت نہیں سمجھا اور نہ کبھی یہ محسوس کیا۔ کہ اسکی آنکھوں

ایسی بھی ہیں جن میں جھانکا جا سکتا ہے۔ بہنیں خوبصورت بھی ہوتی ہیں۔ لیکن۔ بھائیوں نے کبھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں نہیں ڈالیں۔ کبھی ان کے چہروں پر نظر نہیں جمائیں۔ ممتاز اور زمرد کو دیکھ کر کوئی یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ دونوں بہن بھائی نہیں ہیں

آٹھواں باب

کرنل لقمان کو دہلی آئے سات دن ہو چکے تھے جنرل ہیڈ کوارٹر کے بڑے افسر اس سے مل کر نئی ریکروٹنگ پالیسی مرتب کر رہے تھے۔ دہلی کے ماسوا سارے نارتھ ویسٹرن ایریے کی سپر کمان سپرد کر دی گئی تھی اور بریگیڈئیر کا اعزاز عطا ہوا تھا۔

ہفتہ کا دن تھا، وہ کوئی ساڑھے چار بجے کے قریب میجر جنرل کے کمرے سے خوش خوش باہر نکلا تھا۔ آج نئے عہدے کے ساتھ ساتھ یہ نیا اعزاز کوئی کم مسرت بخش نہ تھا۔ نہ جانے کیسے وائسریگل لاج کی لال لال سیڑھیاں اتر کر اپنی موٹر کار کی طرف آتے وقت اس کی نگاہ، بالکل، سٹینڈ کے قریب کھڑی ایک لڑکی پر اٹھ گئی اس لڑکی کو دیکھ کر دل [illegible] زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ گر پڑنے کو ہیں مگر یہ لڑکی زمرد نہ تھی۔ اس نے اس بڑے افسر کو جس کے کندھوں پر بریگیڈئیر کے امتیازی نشانات تھے پورے فوجی آداب کے ساتھ سلام کیا اور کسی قدر مسکرائی [illegible] بھی بغیر کچھ سوچے سمجھے مسکرایا۔ اور اس لڑکی کو جسے دیکھ کر وہ کانپ [illegible] اس نے زمرد سمجھا تھا اپنے قریب بلایا۔ اس لڑکی کی پیشانی۔ وہ دونوں آنکھیں [illegible] ناک بالکل زمرد سے مشابہ تھی، مگر دہانہ اور باقی چہرہ

زمرد سے بہت مختلف تھا۔ زمرد کے چہرے میں معصومیت تھی اور یہ چہرہ بالکل گول تھا
زمرد ایک شگفتہ پھول کی مانند تھی، وہ ایک ایسا چراغ تھی جو ابھی زینتِ محفل نہ ہوا
تھا۔ اور یہ پھول تو مرجھانے پر مائل تھا۔

مگر یہ تشابہ بریگیڈئیر لقمان کے لیئے عجوبہ سے کم نہ تھا۔ اس نے اس لڑکی کے
کندھوں پر دو سفید سفید فیتے دیکھ کر سوچا، ظالم کے فیتے بھی ویسے ہی ہیں جیسے
زمرد کے تھے۔ زمرد کا خیال کیا آیا۔ لقمان کے ذہن کا رخ ہی بدل گیا۔ اس کی بھنویں
کھنچ گئیں۔ اور اس لیے انتہائی تلخی کے ساتھ اس لڑکی سے پوچھا۔

کیا تو زمرد بیگم کی کچھ لگتی ہے۔

لڑکی پہلے سے زیادہ ادب کے ساتھ جھکی۔ پوچھا۔

عالی جاہ، یہ کس زمرد بیگم کے متعلق آپ فرما رہے ہیں۔

بریگیڈئیر حواس میں نہ تھا جواب دیا۔

میجر منو والی زمرد بیگم کے سوا میں کسے پوچھ سکتا ہوں۔

میجر منو، بڑی مشہور شخصیت تھی، ابھی کل ہی زینو۔ بریگیڈئیر آفتاب احمد خاں
کی خدمت میں کاغذات پیش کر رہی تھی۔ بریگیڈئیر آفتاب احمد خاں نے بہت غصے کے ساتھ، اسی سے پوچھا تھا۔

انہیں تم آج پیش کر رہی ہو۔ اور میں نے پرسوں تم کو حکم دیا تھا۔ یہ انٹیلی جنس
برانچ میں اسی وقت پہنچ جائیں۔

اور پھر ذرا رک کر کہا تھا۔

تم عورتیں نہ جانے ہم لوگوں کے دماغ پریشان کرنے کے لیے ہمارے ساتھ
کیوں نتھی کر دی گئی ہو۔

زینو اپنے سارے گروہ میں سب سے زیادہ ذہین اور خوش ادا تیز ی تھی دونوں پر پھیلاتے ہوئے عرض کیا۔

مگر عالی جاہ آپ ہی نے تو ان پر اپنے ہاتھ سے لکھ رکھا ہے انہیں فائل کر دیا جائے

بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں نے اپنے دونوں ہاتھ بہت غصہ کے ساتھ میز پر مارے اور زینو کی خوبصورت شکل کو دیکھے بغیر گرجے۔

زینو۔ میں تمہیں کسی دن اپنے ہاتھ سے گولی مار دوں گا۔ تو بعض دفعہ ایسی باتیں کرتی ہے کہ میرا دماغ کھول اٹھتا ہے۔ حالانکہ تو جانتی ہے میں میجر منّو کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ میں اسے سمندروں کے اندر سے۔ میں اسے زمین کی ساتویں تہ میں سے نکال لاؤں گا۔ اور اسے محض اس لئے معاف نہیں کروں گا۔ کہ اس نے مجھ سے ایک بڑی پونجی چھین لی۔

زینو جانتی تھی یہ بڑی پونجی۔ کون ہے۔ بریگیڈیئر صاحب نے یہ بات کہہ کر کس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ زینو نے اپنی ہر خوش ادائی کے باوجود سہم کر سرخ سیاہی سے بھرا ہوا فونٹین پن ان کے سامنے کر دیا۔ اور بریگیڈیئر صاحب نے اپنے کانپتے ہاتھ سے۔ کچھ سرخ دھبے ان کاغذات پر ڈالے۔ اور پھر دایاں ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ کر اس طرح چپ ہو گئے جیسے سکرات میں مبتلا تھے۔ زینو نے ان کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کی، ان کے سامنے سے کاغذات اٹھائے اور تیز تیز قدم اٹھاتی۔ انٹیلی جنس برانچ میں پہنچی۔ اور چیف کے سامنے حاضر ہو کر یہ کاغذات پیش کر دے۔

بریگیڈیئر لقمان کو اس نے میجر منّو کا ذکر اس انداز سے کرتے پا کر زینو مسکرائی

اور بریگیڈیئر صاحب کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔
مگر عالی جاہ، وہ زمرد بیگم اور میجر منّو تو دونوں کہیں اس طرح گم ہو گئے ہیں۔ جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ البتہ، اب ان کے ظاہر ہونے کا وقت شائد قریب آ گیا ہے۔
بریگیڈیئر صاحب کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اور انہوں نے گھبرائے گھبرائے انداز میں پوچھا۔
لیکن اب یہ اچانک کیا ایسی بات پیدا ہو گئی ہے۔
یہ بڑے راز کی بات تھی۔ یہ بریگیڈیئر۔ آفتاب احمد خان کا ایک بڑا راز تھا۔ زینو کو بریگیڈیئر صاحب کی کوئی ایسی بڑی رازدار نہ تھی۔ مگر انکی پرسنل اسسٹنٹ تھی۔ اور یہ بریگیڈیئر صاحب بالکل افسر تھے ان سے وہ یہ اتنی بڑی بات کہہ نہ سکتی تھی۔ اس نے بات بنائی
وہ مجرم ہیں۔ تا پہلے کسی وجہ سے ان کا معاملہ دب گیا تھا۔ مگر اب پھر ہمارے چیف اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ اور شائد اس سلسلہ میں ہماری انٹیلی جنس، جلد ہی کوئی کارروائی کرے۔
بریگیڈیئر کو یہ زینو پہلے سے بھی زیادہ دلچسپ معلوم ہوئی، اور اُس نے اُس سے مزید باتیں معلوم کرنے کے لئے پوچھا۔
کیا آپ چھٹی کر آئی ہیں، کیا آپ، میرے ساتھ اس وقت چائے پی سکتی ہیں۔
زینو کی گہری گہری لانبی لانبی سیاہ آنکھیں مسکرا پڑیں۔ اس نے اپنی پیشانی پر لہرانے والے سنہری بالوں میں اپنی انگلیاں الجھاتے ہوئے بہت ہی مختصر جواب دیا۔
جی یہ میرے لئے بہت بڑی عزت ہے۔ میں محض ایک اسٹینو ہوں۔ اور آپ۔
بریگیڈیئر مسکرایا۔
اور میں بریگیڈیئر نقمان ہوں)۔ ناردرن ویسٹرن ریکروٹنگ ایریا کا سب سے بڑا افسر۔

بہرحال، میرا جی چاہتا ہے۔ آپ اس وقت میرے ساتھ چلی چلیں۔
زینو ایک بار اور مسکرائی، سائیکل کی طرف دیکھا۔ اور بریگیڈیئر نے اپنے اردلی کو حکم دیا۔
دل صاحب داد خاں۔ تم مس صاحب کا یہ سائیکل سنبھال لو۔
پھر زینو کی طرف دیکھا۔
مس صاحب آپ، صاحب داد خاں کو اپنے گھر کا ایڈریس دے دیں یہ آپ کا سائیکل آپ کے گھر پہنچا دے گا۔
یہ کہہ کر زینو کے لیے موٹر کا پٹ کھولا۔ اور زینو کو اپنی بغل میں بٹھا کر موٹر اسٹارٹ کر دی۔
زینو کے لیے یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ ایک بریگیڈیئر کے پہلو میں اس طرح موٹر میں بیٹھی تھی۔ وہ ایک، بریگیڈیئر کی پرسنل اسسٹنٹ تھی۔ مگر اس کے پہلو میں بیٹھنے کی عزت اسے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ کہاں وہ دفتروں والی خاتون رہنما کار اور کہاں بریگیڈیئر، جس کو نارتھ ویسٹرن ریکروٹنگ ایریا، کی سپر کمان سونپی گئی تھی۔ زینو کا جی چاہا۔ وہ بریگیڈیئر سے کہے۔
بریگیڈیئر صاحب کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ مجھے اپنا پرسنل اسسٹنٹ بنا لیں مجھے یہاں سے چھٹی دلا دیں۔
مگر یہ خواہش ابھی قبل از وقت تھی۔ ابھی تو زینو کے سینہ میں رکھا ننھا سا دل بہت زور سے زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ ابھی تو زینو کے نازک جسم پر ایک عجیب کپکپی طاری تھی یہ کپکپی، تو اس کپکپی سے بہت ملتی جلتی تھی جو زینو کی جوانی کے دروازے پہ پہلی دستک دینے والے میجر شہاب تھے اس شام مسلط

کی تھی جب اس نے اچانک اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔
زینو کو یہ کیکپی سی یاد آئی اس نے کن انکھیوں سے بریگیڈیئر کی طرف دیکھا
بریگیڈیئر اپنے سنجیدہ اور کسی قدر غصہ بھرے چہرہ کو عین سامنے متوازی خط میں
رکھے، اس طرح موٹر چلا رہا تھا۔ جیسے اس موٹر میں ان کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا
وہ اسے دیکھ کر پہلے سے زیادہ سہم گئی اور سوچنے لگی کیا یہ سارے بریگیڈیئر ایک
جیسے ہوتے ہیں۔ ان میں ذرا نرمی نہیں ہوتی

اس بریگیڈیئر کے متعلق صحیح اندازہ تو زینو کو اس وقت ہوا جب بریگیڈیئر لقمان اسے مرینا
ہوٹل کے ایک دلہن کی طرح سجے ہوئے کمرے میں لایا اور مسکرا کر پورے آداب کے ساتھ درخواست کی۔
تشریف رکھیئے۔

وہ سہم کر صوفہ کرسی کے ایک بازو پر بیٹھ گئی۔ بریگیڈیئر لقمان نے، اس کی جھجک دور
کرنے کے لئے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا کہنے لگا!

بی بی اس وقت تم کسی بڑے افسر کی پرسنل اسسٹنٹ یا اسٹینو نہیں ہو تم بریگیڈیئر
لقمان کی مہمان ہو، اس نے تمہیں پوری دلجمعی کے ساتھ چائے کی دعوت دی ہے۔
ذرا سیدھی ہو کر، پوری بے تکلفی سے بڑے صوفہ پر بیٹھ جاؤ اور یہ بھول جاؤ
کہ تم اسٹینو ہو۔

یہ کہہ کر وہ خود، باس تبدیل کرنے کے لئے، اندر کے کمرے میں بڑھ گیا۔
اور زینو نے ڈرتے ڈرتے اُس کے حکم کی تعمیل کی۔ اور پھر نہ جانے کیسے، اس زینو
کے ذہن میں خوش خیالی کی پریاں، زور زور سے ناچنے لگیں۔ ادھر لباس تبدیل
کرتے کرتے۔ بریگیڈیئر لقمان سوچ رہا تھا۔

یہ لڑکی اگر میجر منّو سے متعلق پوری معلومات بہم پہنچا دے۔ تو وہ اسے نہ صرف بھاری انعام دے گا بلکہ اسے کنگ کمیشن دے کر اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بھی بنا لے گا اس کے کم سے کم یہ تو ہو گا کہ زمرد کا آدھا چہرہ ہمیشہ اس کے سامنے رہے گا۔

زمرد کا خیال کیا آیا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں بہنے لگیں۔ اور نہ جانے کیسے اچانک اس کے دل میں ایک نیا خیال جاگا۔

کیا منّو کے نصیب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے سلا کر وہ زمرد کو اپنا نہیں سکتا!

مگر یہ خیال کتنا لغو تھا۔ کتنا پست، اس کے ضمیر نے اس لمحہ سرزنش کی۔

لقمان، تو نے اس عورت کا دودھ پیا ہے جس کی شرافت و پاکنفسی کی لوگ قسمیں کھاتے۔ تو اس باپ کا بیٹا ہے۔ جس نے ایک بڑھیا کے مفاد کی خاطر اسمبلی سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

کیا تو۔ ایک خوبصورت لڑکی کو اپنانے کے لئے اپنے ایک دوست کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے، ذلت و گمنامی کے گڑھے میں پھینک دینا چاہتا ہے۔

ضمیر کی یہ آواز، پوری قوت سے بلند ہو رہی تھی۔ بریگیڈیئر لقمان نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر یوں رکھ لئے جیسے اس کے کان اس آواز سے پھٹے جا رہے تھے۔ اپنی اس بے بسی کے سبب اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ روانی کے ساتھ بہنے لگیں۔ اور یہ بھول ہی گیا کہ جس خوش ادا زینو کو وہ اپنے ساتھ لایا تھا وہ صوفہ پر ٹیک لگائے، اس کے بارے میں کیا کیا سوچ رہی ہے۔

یہ تو صاحب داد خاں آن پہنچا۔ اور اس نے بڑے ادب کے ساتھ اسے اطلاع دی۔

میں نے آپ کی بائیسکل آپ کے فیلٹ پر پہنچا دی ہے

تو اس کا خیال پلٹا، اور اس نے صاحب داد خاں سے پوچھا۔

کیا پاپا نے تو آپ سے نہیں پوچھا۔ میں کس وقت لوٹوں گی۔

صاحب داد۔ سے پاپا نے کچھ نہیں پوچھا تھا صرف بائیسکل رکھ لی تھی۔ صاحب داد خاں نے یہ بات زینو سے کہہ دی۔ تو زینو نے منہ پھیر کر دوسرے کمرے کی طرف دیکھا۔

صاحب داد خاں کوئی دوسری بات کئے بغیر اس کمرے کی طرف بڑھا۔ اور دروازہ پر آہستہ سے دستک دی۔ لقمان نے آنکھیں پونچھ لیں پوچھا۔

کیوں۔

صاحب داد خاں مزاج شناس تھا۔ کہنے لگا۔

کیا حضور، صرف چائے پئیں گے یا وسکی

صاحب داد خاں بہت خوش تھا۔ بریگیڈیئر لقمان زمرد سے ملنے سے پہلے کی روش اختیار کرنے لگے ہیں اسی راہ پر چل نکلے ہیں جس پر زمرد بیگم سے ملنے سے پہلے چلا کرتے تھے۔ اس میں اس صاحب داد خاں کا بڑا فائدہ تھا۔ خوب پینے کو بھی ملتی تھی اور جیبیں بھی ہر وقت پُر رہتی تھیں۔

مگر بریگیڈیئر لقمان کسی اور عالم میں تھا۔ سے تو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا اس کے ساتھ کوئی آیا بھی ہے یا نہیں اسلئے اس نے کچھ سوچے سمجھے بغیر جواب دیا

وسکی کی بوتل یہیں لے آؤ۔ اور دیکھو اگر کوئی باہر آئے۔ یا کسی کا ٹیلیفون آئے تو کہہ دینا ہم باہر ہیں۔

زینو نے یہ بات کیا سُنی، اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ سوچنے لگی۔ بریگیڈیئر صاحب

اسے چائے کی دعوت دے کر، آپ اندر بیٹھ گئے ہیں سارے بڑے افسر ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔

لیکن صاحب داد خاں، افسر نہ تھا اردلی تھا، وہیں کھڑے پوچھا۔

لیکن صاحب، وہ بی بی جو باہر صوفہ پر بیٹھی ہیں ان کو کیا کہوں۔

بریگیڈیئر نے حیرت سے پوچھا۔

مگر یہ کون بی بی بغیر اجازت کے اندر آ گئی ہیں۔

زینو کو ایسے لگا جیسے زمین پھٹنے لگی ہے۔ مگر زمین پھٹ نہیں رہی تھی صاحب داد خاں کہہ رہا تھا۔

عالی جاہ ابھی بڑے دفتر سے اس بی بی کو آپ ہی تو اپنے ساتھ لائے ہیں، موٹر میں بٹھا کر اور میں ان کا سائیکل ان کے گھر پہنچا کر آیا ہوں۔

وہ پاگل لقمان، اپنی جگہ سے اُٹھا نہیں اُچھلا، شرماسے شرمائے باہر آیا اور زینو کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر معذرت کی۔

معافی چاہتا ہوں۔ مجھے دل کی بیماری ہے۔ اس کا دورہ اچانک پڑ گیا تھا اور میں۔

زینو کا جی چاہا، اپنے یہ ہاتھ بریگیڈیئر صاحب کے دل پر رکھ کر پوچھے۔

عالی جاہ جب آپ دل کے مریض ہیں، تو پھر مجھے اپنے ساتھ کیوں لائے ہیں۔

میں تو جس دنیا سے تعلق رکھتی ہوں، وہاں یہ بیماریاں نہیں ہوتیں۔ میں تو صرف ان لوگوں کے پاس جاتی ہوں جو چند گھڑی ہنس کھیل اور اچھل کود کرنے کے سوا کوئی دوسرا شغل پسند نہیں کرتے۔ میں سمجھی تھی۔ دوسرے کیپٹنوں میجروں، اور لفٹنٹ کرنلوں کی طرح آپ بھی مجھے اس لئے ساتھ لائے ہیں کہ چند گھڑیاں میرے

ساتھ ہنس کھیل کر گزاریں۔

مگر بریگیڈیر لقمان، جس عجز و جس ندامت اور جس شرمساری کے ساتھ معذرت کر رہا تھا اس سے زینو کے اندر اچانک ایک نئی اُمید پیدا ہو گئی تھی ایک نیا چراغ جل اُٹھا۔

بریگیڈیر لقمان ابھی تک مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس نے پاس کھڑے صاحب داد خاں سے کہا۔

صاحب داد خاں، یہ ہماری کتنی بڑی بھول تھی کہ ہم اس معزز خاتون کو اپنے ساتھ لائے اور یہاں انہیں باہر بٹھا کر آپ اندر پہنچ کر بھول گئے۔

صاحب داد خاں۔ تم کوئی سزا ہمارے لیئے تجویز کرو۔

صاحب داد خاں ایسی سزائیں تجویز کرنے کا پرانا عادی تھا۔ مسکرایا جواب دیا۔

عالیجاہ! میری تجویز ہے کہ آپ۔ اس خاتون کو اس بھول کے عوض پانچسو روپے نقد عطا کریں۔ مجھے ایک وسکی کی بوتل دیں۔ اور آپ، اس خاتون کے ساتھ بیٹھ کر اس قدر پیئیں۔ کہ ہوش و حواس کھو بیٹھیں!

سرکار۔ میں نے۔

بریگیڈیر لقمان نے بہت تعجب کے ساتھ پہلے صاحب داد خاں کو اور پھر اس خاتون کو دیکھا۔ یہ خاتون اس تجویز پر آپ ہی آپ مسکرا دی۔ بریگیڈیر کے دماغ کو ایک زور کی چوٹ پہنچی۔ اس نے سوچا

یہ لڑکی تو ویسی نہیں ہے جیسی لڑکیاں چھ مہینے پہلے یہ صاحب داد خاں گھیر گھار کر لایا کرتا تھا۔

اس کا جی چاہا پانچسو روپے اسے دے کر، اس سے کہے، اسے لڑکی تو بھی
اسی وقت یہاں سے چلی جا ہم سے بڑی بھول ہوئی، تمہیں اپنے ہاں لائے۔

مگر اس لڑکی کے چہرے کی مشابہت زمرد بیگم کی سی تھی، اس کی لانبی آنکھیں
اس کی پیشانی اس کے گھنگھریالے سنہرے بال بالکل زمرد بیگم ایسے تھے۔

اس لڑکی کی وہ یوں بے حرمتی نہ کر سکتے تھے۔ یہ تو صاحب داد خاں نے بہت
بے ہودہ بات کی۔ یہ تو اس لڑکی کے شایان شان نہ تھی۔ اور اس نے صاحب داد خاں کو ڈانٹا۔

صاحب دادا خاں، تم آدمی کو پہچانتے نہیں ہو۔ تم نے بی بی کی توہین کی ہے
ان سے ابھی ابھی معافی مانگو۔

صاحب دادا اس کا نوکر تھا۔ اس نے بی بی سے معافی مانگ لی، اور بی بی سوچنے
لگی کن لوگوں میں آن پھنسی ہے۔

یہ لوگ سچ مچ کچھ عجیب تھے۔ صاحب داد خاں تو ضرورت سے زیادہ عجیب تھا۔
وہیں، وسکی کی بوتل اور تین پگ اٹھا لایا، اور آپ ہی آپ تین پگ بھر کر ان دونوں
سے درخواست کی شوق فرمائیے۔

اور میں بھی آپ کے ساتھ شوق فرماؤں گا۔ مس صاحب کی صحت کی دعا
کروں گا۔ ان کا جام صحت پیوں گا۔

وہ دونوں ہنس پڑے۔

صاحب داد خاں پینتالیس سال سے تجاوز کر گیا تھا۔ وہ نعمان کا خاندانی
نوکر تھا، اس کے باپ دادا نے نعمان کے باپ دادا کی خدمت کی تھی اور اس کے
دادا نے نعمان کے دادا کے ہاتھ دھلوائے تھے۔ صاحب داد خاں نعمان خاں

کے حصے میں آیا تھا۔ گو اس سے آٹھ سال بڑا تھا۔ لیکن عموماً، حدود میں رہتا کبھی کبھی حد سے تجاوز کر جاتا۔ آج بھی حد سے تجاوز کر گیا تھا۔ یہ تجاوز پورے چھ مہینے کے بعد صرف ایک بار ہوا تھا۔ اس لئے لقمان نے بُرا نہ مانا اور مسکرا کر زینو سے پوچھا۔

کیا آپ بھی شوق فرمائیں گی یا آپ کے لئے کچھ اور منگوایا جائے۔

صاحب داد خاں نے پورا ایک حلق میں انڈیلنے کے بعد، خود ہی مداخلت کی۔

سرکار! یہ شوق کیوں نہ فرمائیں گی یہی تو ایسے شوقوں کی عمر ہے۔

زینو بیچاری تو ایسے شوق قریب قریب روز فرماتی اپنی خوشی سے نہیں دوسروں کی خوشی سے اس نے گلاس، اٹھالیا۔

یہ گلاس پھر بار بار اٹھا۔ اور زینو کے چہرے پر اس شراب نے جو انی کچھ اس طرح چھلکا دی اس کے گال کچھ اس طرح تر و تازہ کر دئے کہ بریگیڈیئر لقمان کے ہاتھ کانپنے لگے۔

ابھی تک صاحب داد خاں یہیں تھا۔ اب تک ساتھ دے رہا تھا۔ اس نے صاحب داد خاں کی طرف اس طرح دیکھا جیسے چھ مہینے پہلے اس وقت دیکھنے کا عادی تھا جب یہ صاحب داد خاں، ہر دوسرے چوتھے نئی نئی عورتیں اس کے پاس لاتا۔

صاحب داد خاں مسکرایا اور آپ ہی آپ۔ پیچھے ہٹ گیا۔

اس کے جاتے ہی بریگیڈیئر لقمان نے سب سے پہلی بات جو اس زینو سے پوچھی وہ میجر منو کے متعلق تھی۔ زینو ذہنی توازن قریب قریب کھو چکی تھی۔ اس نے لڑکھڑاتی لڑکھڑاتی آواز میں جواب دیا۔

میجر منو پر الزام ہے کہ وہ، بغیر اطلاع غیر حاضر ہوئے۔ اور کچھ عجیب سیکرٹ اپنے ساتھ لے گئے۔

اور اس طرح اپنے جرم کی نوعیت سنگین کر لی۔

بریگیڈئیر لقمان کو یہ نئی بات معلوم ہوئی۔ یہ بات میجر منّو نے اس سے نہیں کہی تھی۔ اس نے انتہائی حیرت کے ساتھ زنیو سے پوچھا۔

زنیو کیا اس کے سوا منّو پر کوئی الزام نہیں ہے کیا منّو نے کسی عورت پر حملہ نہیں کیا تھا

زنیو نے اپنی خوبصورت پیشانی پر بہت زور سے ہاتھ مارا۔

جی، ان پر، ایسا کوئی الزام نہیں ہے۔ ان پر جو الزام ہے۔ وہ صرف اتنا ہی ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ان کے بھائی نے ہمارے بریگیڈئیر صاحب کے ہاتھ سے وہ خوبصورت عورت چھین لی۔ جس پر بریگیڈئیر صاحب ہزار جان سے فدا تھے۔

لقمان نے جلدی سے پوچھا۔

یہ کون عورت ہے۔

زنیو مسکرائی جواب دیا۔

یہ نزہت بیگم ہیں۔ سر وجاہت عالم مرحوم کی اکلوتی اور انوکھی صاحبزادی! پہلے میجر منّو پہ عاشق تھیں کچھ دن بریگیڈئیر صاحب کو کھلایا اور اب میجر منّو کے بڑے شادی شدہ بھائی سے شادی کر لی ہے۔

وہ ذرا رک گئی۔ اپنے بھرے ہوئے سینے پر ایک ہاتھ رکھ کر بات جاری رکھی

یہ شادی پرسوں ہی تو ہوئی ہے۔ اس شادی نے ہمارے بریگیڈئیر صاحب کے مزاج پر بہت بڑا اثر کیا ہے۔

چھ مہینے سے جو کاغذات دبائے ہوئے تھے اب وہ پھر نکالے گئے ہیں پھر انٹیلی جنس کو حکم ہوا ہے۔ کہ میجر منّو کو ڈھونڈے۔

بریگیڈیئر لقمان کو ایسے لگا جیسے اس زینو نے، ان کے دل پہ ہاتھ ڈال کر اس کی رگیں کھینچ لی ہیں۔ منّو کے خلاف یہ تو محض جعل سازی کی جارہی تھی۔ اس کا جی چاہا، ابھی کمانڈر انچیف کا نمبر ملا کر اس سے کہے۔

کیا آپ نے مجھے آج بریگیڈیئر کا اعزاز اس لئے دیا ہے کہ میرے ایک گھرے دوست کے خلاف ایک جعلی کارروائی ممکن ہو سکے۔

مگر اس نے اپنے دل کی یہ خواہش پوری کرنے سے پہلے۔ زینو سے پوچھا۔

کیا تمہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ میجر منّو نے نزہت بیگم پر قاتلانہ حملہ نہیں کیا، اس کو گولی نہیں ماری!

زینو ہنسی۔ اور پہلے سے کسی قدر مختلف انداز میں اپنی لانبی لانبی سیاہ آنکھوں کو نچاتے ہوئے کہنے لگی۔

یوں، اس بے چاری کے دل پر تیر تو خوب چلائے تھے میجر منّو نے لیکن پستول د دستول تو کبھی استعمال نہیں کیا۔ وہ تو ان کے بھائی سے بیاہ بھی دی گئی ہیں۔ پرسوں بڑی دھوم دھام سے کنور صاحب کی برات نزہت کے ہاں آئی اور آج ولیمہ کا جشن منایا جارہا ہے۔ تین ہزار سے زیادہ معززین جمع ہونگے کرنیل نواز یار جنگ بہادر کے بنگلہ پر۔

بریگیڈیئر لقمان نے جلدی سے پوچھا۔

کیا یہ کرنیل نواز جنگ منّو کے ماموں تو نہیں۔

زینو نے اثبات میں اپنا خوبصورت سر ہلا دیا۔

بریگیڈیئر لقمان، اسی لمحہ اپنی جگہ سے اُٹھا، کچھ کہے بغیر اندر بڑھا۔ اپنی وردی جلدی جلدی پہنی۔ باہر آیا۔ اور زینو کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے۔ اسے اوپر اُٹھایا۔

کیا تم کرنل صاحب کے مکان تک میرا ساتھ دو گی۔

زینو کا جی چاہا کہے۔

بریگیڈیئر صاحب اگر آپ فرمائیں تو میں زندگی کے آخری کنارے تک آپ کے ہم رکاب چل سکتی ہوں۔

مگر بریگیڈیئر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا۔ باہر لے آیا۔ اس نے اسے ایک بار پھر اپنے پہلو میں بٹھایا۔ اور نواز ولا کی راہ لی۔

اس نواز ولا میں اس نے گو تین سال پہلے صرف ایک رات کاٹی تھی مگر یہ رات اسے اچھی طرح یاد تھی اور کرنل نواز جنگ کی لمبی لمبی مونچھوں کو تو وہ قطعاً نہیں بھولا تھا۔

نواز ولا، آج دلہن کی طرح سجا تھا۔ اس کے دونوں طرف کے لان، باغیچے، اونچے اونچے سائبانوں سے ڈھکے تھے۔ اور رنگ برنگ کے قمقمے، ہر طرف یوں جل رہے تھے جیسے دیوالی منائی جا رہی تھی۔ ان کی موٹر دروازہ پر پہنچ کر رکنے کو تھی کہ دروازہ پر پہرہ دینے والے دونوں سنتریوں نے بہت احترام کے ساتھ فوجی سیلوٹ کر کے انہیں سیدھے بڑھ جانے کا اشارہ کیا، بریگیڈیئر صاحب، موٹر کو ڈرائیو کرتے سیدھے۔ وہاں آن پہنچے جہاں بڑے کرنل صاحب، کنور منصور احمد خان اور کئی دوسرے میزبانوں کی معیت میں کھڑے، انتظامات کا معائنہ کر رہے تھے۔

ابھی کھانے کا وقت نہیں ہوا تھا، بریگیڈیئر دوسرے مہمان تھے، جو وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے آن پہنچے تھے۔

بریگیڈیئر لقمان موٹر سے اتر کر، زینو کے ساتھ جس وقت کرنل صاحب کے قریب آیا۔ کرنل صاحب، نے اسے بہت گھور گھور کر دیکھا اور پھر نہ جانے کیسے ان کے چہرے پر

پر چھائی مسکراہٹ اچانک کافور ہو گئی۔ وہ گھبرا سے گئے وہ سمجھے یہ بریگیڈیئر اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جس کی پہلی کڑی اینٹی جلندر برانچ کے چیف کرنیل بیلی کی آمد تھی۔ لیکن دوسرے لمحے جب بریگیڈیئر لقمان نے بہت نیازمندی کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر انہیں حیدر آبادی طرز کا آداب عرض پیش کیا تو انہیں لقمان کا چہرہ کچھ پہچانا پہچانا محسوس ہوا۔ اور انہوں نے دوسرے لمحے لقمان کے کندھے پر اپنے دونوں ہاتھ اس طرح رکھ دئیے جیسے اپنی پہچان کا اعلان کر رہے تھے یہ تو وہی لقمان تھا جو پورے چھ گھنٹے ان کی صحبت میں رہا تھا اور انہیں اکسفورڈ کے کتنے ہی دلچسپ قصے سنائے تھے۔

مگر اس وقت، محض لفٹننٹ کرنیل تھا اور اب بریگیڈیئر کے نشانات سے اس کے کندھے چمک رہے تھے۔ ان کے چہرے پر پھر پہلے ایسی مسکراہٹ جھلک آئی تھی اور وہ لقمان کا تعارف کنور منصور احمد خاں سے کراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

یہ بریگیڈیئر لقمان رسول ہیں۔ ان کے والد مرحوم مدراس کے میئر اور مشہور ایم ایل اے تھے۔

لقمان کی طرف متوجہ ہو کر کنور منصور احمد خاں کے متعلق فرمایا۔

یہ کنور منصور احمد خاں آف شمیم پور، بھانجے اور منور کے بڑے بھائی ہیں۔

منور کے بھائی کہتے وقت ان کی آواز اچانک کانپ گئی۔ بریگیڈیئر لقمان دیو نواب سعید اللہ اور سیٹھ رام جوایا سب نے کپکپاہٹ محسوس کی۔ مگر کرنیل صاحب نے فوراً لقمان کو نواب سعید اللہ اور سیٹھ رام جوایا کے ساتھ متعارف کرا کر اس کپکپی پر غلبہ پا لیا

پھر انہوں نے موضوع سخن بدلتے ہوئے بریگیڈیئر کو اس جلد جلد ترقی پر مبارک باد دی اور افسوس ظاہر کیا کہ منو بدنصیب کے نصیب پھوٹ گئے۔

پھر کیسے انہوں نے لقمان سے پوچھ لیا۔
کیا تمہیں بھی اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔

اسے بہت کچھ معلوم تھا، اپنے اس علم کے اظہار میں اس نے کسی قسم کا بخل نہیں برتا اور دوسرے لوگوں سے معذرت کر کے وہ کرنل صاحب کے ساتھ ہولے ہولے چلتا انہیں تھوڑے فاصلے پر لے آیا۔ اور پھر ہر بات ان سے کہہ دی۔ اور انہوں نے لقمان کو اس طرح سینہ سے لگا لیا جیسے یہ لقمان، ان کے کسی مرے ہوئے بچے کی زندگی کی خبر لے آیا تھا۔

وہ اسے دیوانہ وار کھینچتے ہوئے، اندر زنانہ میں لے گئے۔ اور اسے اپنی دونوں بہنوں اور نزہت بیگم کے حضور پیش کرتے ہوئے۔ ان سے کہا۔

اسے سب جھک جھک کر آداب بجا لاؤ، اس نے تم سب پر وہ احسان کیا ہے جو شاید کوئی کر نہ سکتا۔

پھر ساری باتیں ان سے کہہ دیں اور وہ تینوں سچ مچ اس لقمان کے سامنے رکوع کے بل جھک گئیں۔ اور جب نزہت بیگم اس کے سامنے جھکی تھی تو اس کی لانبی لانبی انتہائی خوبصورت آنکھوں میں خوشی کے آنسو کانپ رہے تھے۔

یہ آنسو اس نے دیکھ لیے۔ اور ایک لمحہ کے لیے، سکتے میں آ گیا۔

یہ لڑکی تو وہ ہے جسے منو نے زخمی کیا تھا۔ یہ تو وہ ہے جس نے منو کی جگہ اس کے بھائی سے شادی کر لی ہے مگر یہ کیسی لڑکی ہے جو ایک دوسرے مرد کی بیوی بننے کے بعد اس مرد کے زندہ ہونے کی خبر پا کر آنسو بہا رہی تھی جس نے اسے ایک دوسری عورت کے لیے زخمی کیا تھا۔

یہ لڑکی بڑی عجیب تھی اس نے بریگیڈیئر لقمان سے التجا کی۔
بریگیڈیئر صاحب اگر آپ مناسب سمجھیں تو دو منٹ کے لیے فدا اس کونے میں تشریف

تشریف لے چلیں۔ میں آپ سے منو کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

دونوں راہبوں اور کرنیل صاحب نے اس نزہت کو دیکھا۔ کرنیل صاحب مسکرائے فرمایا تم نزہت دلہن سے باتیں کرو۔ میں آنے والے مہمانوں سے نپٹ لوں یہ کہہ کر وہ تو باہر نکل گئے۔ اور نزہت بچوں کی طرح روتے ہوئے بریگیڈیر سے منو کے متعلق ایک ایک بات از سر نو پوچھنے لگی۔ سب سے پہلے اس نے پوچھا۔

کیا منو نے آپ سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اس نے ایک اور عورت کی خاطر مجھ پر فائر کیا تھا۔ اس عورت کی خاطر، جسے وہ گندگی اور غلاظت کے ڈھیر سے اٹھا کر لایا تھا۔

بریگیڈیر لقمان نے ہاتھ اُٹھا کر اسے ٹوک دیا۔

محترمہ! اس عورت کے متعلق ایسے الفاظ استعمال نہ کیجئے۔ جو انسانیت کے ایک ایسے اونچے مینار پر کھڑی ہے جہاں ننانوے فی صدی عورتیں پہنچ نہیں سکتیں۔

نزہت کو ایسے لگا جیسے۔ منو کی طرح اس بریگیڈیر کا دماغ بھی۔ اپنا توازن کھو چکا ہے۔ اور اس آوارہ جادوگرنی نے اسکے دل کو بھی اپنے قبضہ میں کر لیا ہے۔

وہ اپنے الفاظ واپس لینے کو تیار نہ تھی۔ لیکن ابھی اسے اس لقمان سے منو کے متعلق بہت سی باتیں معلوم کرنا تھیں اس لئے اس نے۔ معذرت کی۔

مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے ان جانے بوجھے ایسے الفاظ استعمال کئے۔

پھر نہ جانے کیسے اس نے دوسرا سوال اسی زمرد بیگم کے متعلق کیا۔ اس نے پوچھا۔

یہ زمرد بیگم بھی کیا منو کے ساتھ اور سینر چلی گئی ہے۔

لقمان نے اسے ساری صورت حال سے بہت مختصر الفاظ میں آگاہی دیدی اور پھر نہ جانے کیوں پوچھا۔

کیا آپ کے زخمی ہونے کی بات۔ آپ کے گھر کے سوا دوسرے لوگوں کو بھی معلوم ہے اور کیا فوج کا کوئی بڑا افسر تو اس راز سے واقف نہیں ہے۔

نزہت نے جواب دیا۔

ہمارے گھر کے سوا۔ ہمارے خاندانی ڈاکٹر، دو ایک مخصوص معتمد نوکر انیوں اور آپ کی ذات کے سوا کوئی دوسرا یہ راز نہیں جانتا۔

بریگیڈیر کے چہرے پر دفعتاً ایک عجیب نور چمک اٹھا، اور اس نے انتہائی مسرت کے ساتھ نعرہ لگایا۔ تو پھر میں منّو کا پرسنل فائل بدلوا دوں گا۔ پھر میں اسکے خلاف ہر بے قاعدگی کا الزام حرفِ غلط کی طرح مٹوا دوں گا۔

پھر میں آپ اسکی پیشانی پر سہرا باندھوں گا، آپ زمرد بیگم سے اسکا بیاہ کر دینگا۔ یہ کہتے کہتے اس کی سرخ سرخ آنکھیں ستاروں کی طرح دہکنے لگیں اور نزہت بیگم نے لرزتے لرزتے دل کے ساتھ اپنا سر اس کے سامنے جھکا دیا۔

مہمان عورتوں کے قافلے کے قافلے۔ بڑھے چلے آ رہے تھے بریگیڈیر لقمان کو یہاں سے باہر بھاگنا پڑا۔ باہر مہمانوں کا سیلاب امنڈ رہا تھا۔ اور اس امنڈتے سیلاب میں بریگیڈیر لقمان نے زینو کو ڈھونڈا۔ پھر اس کا بازو، اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر یہاں سے اس طرح نکل بھاگا جیسے اس سیلاب سے ڈر گیا تھا۔

اس کی موٹر، ایک بار پھر نئی دہلی کی بڑی سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ اور وہ کسی اور کے بنگلے کی طرف نہیں۔ کمانڈر انچیف کے دروازہ پر آن پہنچا تھا۔ دروازہ پر پہرہ دینے والے گورکھا سپاہیوں نے، اس کی موٹر کو رکنے کا اشارہ کیا۔ اور جب اس نے ذرا باہر کو اپنا کندھا نکالتے ہوئے اسے اپنے فوجی نشانات دکھائے۔ تو انہوں نے

بڑے احترام کے ساتھ فوجی سیلوٹ مارا۔ آگے کے موڑ پر، گورے پہرہ داروں نے اسکی راہ روکی۔ وہ اس بار آپ باہر نکلا۔ اور گوروں نے، پھر اسکے احترام میں سلامی دی۔

پھر وہ ریسپشن آفس میں تھا۔ اور کمانڈر انچیف کے پرائیوٹ سیکریٹری کو ٹیلیفون کر رہا تھا، آج ہی کمانڈر انچیف نے، اس سے پورے دو گھنٹے باتیں کی تھیں۔ اور اسکی کارگزاری کی تعریف میں ایسے الفاظ استعمال کئے تھے جو آج تک کسی ہندوستانی کے متعلق استعمال نہ کئے گئے تھے پرائیوٹ سیکریٹری بڑا ذہین آدمی تھا اس نے اسی وقت اس بڑے ہندوستانی فوجی افسر کے آنے کی خبر کمانڈر انچیف صاحب کے گوش گزار کر دی اور کمانڈر انچیف، نے اسے حکم دیا بریگیڈیئر نعمان کو اپنے ساتھ اندر لے آئے۔

زینو، باہر موٹر میں بیٹھی رہی، وہ آج سے پہلے، ہندوستانی افواج کے اس بڑے کمانڈر کے بنگلہ پر کبھی آئی نہ تھی۔ اور دل ہی دل میں اس فخر پر پھولی نہ سمائی۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد جب بریگیڈیئر نعمان، مسکراتے ہوئے۔ موٹر کے قریب پہنچا۔ تو زینو نے بڑے ادب کے ساتھ دروازہ کھولا اور جھک کر درخواست کی

تشریف لایئے۔

بریگیڈیئر موج میں تھا، زینو کا ہاتھ پکڑ کر، اس کے سہارے موٹر میں چڑھا۔ اور موٹر اسٹارٹ کر دی۔

میرینا ہوٹل کے قریب پہنچ کر، اس نے دفعتاً زینو سے پوچھا۔

کہاں اُتاروں آپ کو۔

زینو کا نشہ اُتر رہا تھا۔ اسکا جی چاہا، بریگیڈیئر سے کہے۔

اگر دو پیگ اور آپ کے ساتھ پی لوں تو بہت اچھا ہو۔

لیکن جب بریگیڈیئر نے دوبارہ یہی بات پوچھی تو اس نے، دبی دبی آواز میں جواب دیا۔

یہیں اُتار دیجئے۔ میں تانگہ میں بیٹھ کر گھر چلی جاؤں گی۔

بریگیڈیئر ہنسا۔

نہیں بھئی، آپ نے آج ہمارا اتنا بڑا کام کیا ہے۔ آج آپ نے ہماری اس قدر مدد کی ہے ہم تو نہ صرف آپکو آپکے گھر پہنچا کر آئینگے۔ بلکہ آپکے والد صاحب سے بھی ملینگے۔

زینو کے دل میں اُمید کے چراغ پھر جلنے لگے۔ اور اس نے بڑی سرخوشی کے ساتھ جواب دیا۔

میرا گھر اشوکا روڈ کے سرے پہ ہے۔ یہ تو ہماری بڑی خوش نصیبی ہوگی کہ آپ جیسے بڑے آدمی ہمارے گھر پدھاریں گے۔ اور میرے پاپا تو اس درجہ خوش ہونگے کہ میں بیان نہیں کرسکتی۔

بریگیڈیئر نے موٹر کا رخ اشوکا روڈ کی طرف پھیر دیا۔ اور موٹر یوں اُڑنے لگی جیسے ہوا سے بندھی تھی۔

اشوکا روڈ کے سرے پہ مینیر کلارکس کے کوارٹرز کے قریب پہنچ کر زینو نے بریگیڈیئر کی راہ نمائی کی۔ اور ایک مختصر سے کوارٹر کے سامنے پہنچ کر درخواست کی۔

یہیں روک لیجئے۔ یہی ہمارا گھر ہے۔

بریگیڈیئر اس کے ساتھ موٹر سے اُترا، زینو کے ساتھ ساتھ چلتا، کوارٹر کے برآمدہ میں آیا۔ جہاں ایک بوڑھا شریف آدمی ایک چوکی پہ دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ زینو نے اسے آواز دی۔

پاپا، دیکھو یہ میرے ساتھ کون آئے ہیں۔

پاپا نے آنکھیں کھولیں اور بجلی کی مدھم روشنی میں اس بڑے فوجی افسر کو دیکھا۔ شاید اچھی طرح جان نہ سکا تھا کہ اس فوجی افسر کا رینک کیا ہے۔ بیٹی نے تعارف کرایا

پاپا یہ بریگیڈیئر لقمان ہیں یہ بہت بڑے افسر ہیں، اتنے ہی بڑے افسر جتنے ہمارے صاحب ہیں

پاپا چوکی پر سے اٹھا اور حیدرآبادی مسلمانوں کی طرح رکوع کے بل جھک گیا بریگیڈیر نے اوڑھے کے جھکے ہوئے سر کو اوپر اٹھایا اور درخواست کی ۔

بزرگ پاپا اسطرح آدمی آدمی کے سامنے جھکا نہیں کرتے آپ اور ہم دونوں آدمی ہیں ایک ہی باپ کی اولاد ہیں ۔

یہ بات اس بزرگ پاپا کو خود بھی اچھی طرح معلوم تھی لیکن اس کی اس بیٹی نے جو دو سو روپے ماہوار کی نوکری کر رہی تھی اور اس بوڑھے کا اور اس کی دو ادھیڑ عمر کی بہنوں کا خرچ چلا رہی تھی اسے یہی تعلیم دی تھی کہ جب وہ اس کے بڑے افسران سے ملے تو ان کے سامنے اسی طرح جھکے ۔ مگر آج سے پہلے کسی دوسرے بڑے افسر نے اس بوڑھے سے وہ بات نہ کہی تھی جو بریگیڈیر نے کہی ۔ بوڑھا پاپا اسقدر خوش ہوا کہ اس بڑے افسر کو ہزار ہزار دعائیں دینے لگا ۔

زینیہ پاپا کو دعائیں دیتے چھوڑ کر ، ایک لمحہ کے لیے اندر بھاگ گئی اور اس چھوٹے کمرے میں پہنچ کر جہاں وہ اپنے دوستوں کو لانے کی عادی تھی کھڑی سوچنے لگی اگر اسے معلوم ہوتا کہ کبھی اتنا بڑا افسر اس کے ہاں آئے گا تو وہ اپنے اس کمرے کو خوب سجا رکھتی ۔ گو یہ کمرہ خوب سجا نہ تھا ۔ لیکن اس میں اچھی خاصی نفاست ضرور تھی اور جب بریگیڈیر پاپا کے ساتھ اندر آیا تو وہ اس مختصر سے کمرے کی نفاست کو دیکھ کر بہت مسرور ہوا اور اس نے ایک چھوٹے سے دیوان پر بیٹھتے ہوئے ، بغیر کسی توقف کے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا ، اور سو روپے کے دس نوٹ پاپا کے ہاتھ پر رکھ کر التجا کی ۔

پاپا ، یہ رقم میری طرف سے اس لیے قبول فرمائیے کہ آپ کی بیٹی نے آج ایک بڑی عمدہ خدمت انجام دی ہے آج اس نے مجھے ایک بہت بڑی تشویش سے نکالا ہے ۔ اگر آپ اجازت دیں اور مناسب سمجھیں ۔ تو میں آپ کی اس بیٹی کو کنگ کمیشن دلوا کر اپنے ساتھ اپنے ہیڈ کوارٹر لے جاؤں ۔

وہ ذرا رکا اور پاپا کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا ۔

اگر آپ کو یہ بات منظور ہو تو زنیو کی زبانی، صبح دس بجے تک مجھے کہلوا دیں۔
آپ اور آپ کے لواحقین ساتھ چلیں تو میرے لیے اور بھی مسرت کا باعث ہو گا۔
یہ سن کر زنیو کے چہرے پر ایک عجیب سرخی جھلک آئی تھی۔ اور اس کا جی چاہ رہا تھا مستانہ وار ناچنے لگے۔ اس نے آج تک یہ بات خواب میں بھی نہ سوچی تھی کہ اسے کبھی کنگ کمیشن ملے گا۔ اور اس کا شوہر بھی فوجی افسروں میں ہو سکے گا۔ وہ بھی اپنے پاپا کے لیے اچھی اچھی چیزیں خرید سکے گی اور اپنی پھوپھیوں کے لیے بہتر لباس سلوانے کے قابل ہو گی۔
پاپا نے اپنی اکلوتی بیٹی کے چہرے پر اچانک جھلک آنے والی سرخی دیکھ لی تھی۔ اور ایک بار پھر اس بڑے افسر کے سامنے جھک گیا تھا جو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور باپ بیٹی کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے اجازت چاہ رہا تھا۔
وہ دونوں اسے باہر تک چھوڑنے آئے وہ اکیلا موٹر میں بیٹھا اور موٹر مرینا ہوٹل کو جانے والی سڑک پر بھاگنے لگی۔
بریگیڈیئر کی آنکھیں، ایک بار پھر بھیگی تھیں اور ڈوبے ڈوبے دل کے ساتھ سوچ رہا تھا۔
کیا زمرد کے بغیر وہ جی سکے گا یا پانی بن مچھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر مر جائے گا؟
اسی رات اس نے روتے ہوئے زمرد کو خط لکھا میجر منو کے متعلق ساری باتیں اس سے بیان کر دیں اور آخر میں لکھا۔
صبح کمانڈر انچیف کی طرف سے، میجر منو کی بحالی کے احکام ہوائی ڈاک کے ذریعہ اور اردو سینز بھیج دیے جائیں گے۔ وہ نہ صرف بحال ہو گا بلکہ اسے ترقی بھی ملے گی اس نے اور رنگیز میں بھرتی ہو کر بڑائی کا اظہار کیا ہے اس کا اسے صلہ ملے گا۔
ایک جملہ اپنے بارے میں بھی روتے روتے لکھ دیا۔

میرے دل پر جو بیت رہی ہے۔ وہ میں ہی جانتا ہوں لیکن فرض، محبت سے ہمیشہ جیتا ہے۔ اور میں خوش ہوں کہ میری ہار ہوئی۔

صبح اس نے اپنے ہاتھ سے یہ خط بڑے ڈاکخانہ کے لیٹر بکس میں ڈالا۔ اور جب وہ لوٹ کر ڈاکخانہ کی سیڑھیاں اترا تو اسکی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

وہ تیز تیز چلتا، ہوٹل آیا، اور جب ہوٹل پہنچا۔ تو نو بج رہے تھے۔ اور زینو اسکے کمرے کے دروازہ پر کھڑی اسکا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے زینو کی طرف دیکھا۔ تو زینو نے خوبصورت سر جو بیگم سے کسی حد تک مشابہ تھا جھکا لیا، بریگیڈیئر کو ایسے لگا جیسے اسکے دل کو کسی نے نوچ لیا ہے۔ اس نے سوچا زینو کا یہ تشابہ تو اسے مار ڈالے گا۔ اس کا جی چاہا زینو سے کہے۔

زینو ہم سے غلطی ہوئی، ہم نے تمہیں اپنے ساتھ چلنے کی درخواست کی تھی، ہم تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکیں گے۔ یوں تمہیں کنگ کشن یہیں مل جائے گا۔

مگر زینو نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔ اور انتہائی حسرت کے ساتھ کہا۔

پاپا نے بہت شکریہ کے ساتھ آپکی تجویز مان لی ہے اور وہ آپکے ساتھ چلنے کو آمادہ ہیں۔

بریگیڈیئر کے چہرے پر اداسی سی پڑ گئی۔ اس کا دل، بہت زور سے دھڑکا۔ مگر وہ بڑا ضابطہ تھا۔ اپنے اوپر قابو پا لیا۔ اور زینو کی طرف دیکھ کر حکم دیا۔

اندر بیٹھ کر ایک درخواست لکھ کر، صاحب داد خاں کو دے دو اور پھر چلی جاؤ۔ اور شام تک روانگی کی تیاری کر لو۔ روپے پیسے کی ضرورت ہو تو صاحب داد خاں سے مانگ لو۔

یہ کہہ کر، وہ کمرے میں داخل ہوئے بغیر، باہر کو لپکا۔ اور موٹر میں بیٹھ کر وانسٹر لاج کی طرف چل دیا۔

اس نے، آپ، میجر منو کے متعلق، احکام، کمانڈر انچیف کے دفتر سے لئے،

آپ اپنے سامنے انہیں متعلقہ افسر کے پاس پہنچایا اور اس وقت تک اس افسر کے کمرے سے باہر نہیں نکلا جب تک یہ احکام، اور دفتر جانے والے خطوط کے تھیلے میں رکھ نہ دیے گئے۔ پھر اس نے میجر جنرل BP سے الوداعی ملاقات کی۔ اور دفتر سے نکل کر ہوٹل پہنچا۔ راستہ بھر اسکی آنکھیں بہتی رہی تھیں اور دل تڑپتا اور بلکتا رہا تھا ہے

ابھی وہ ہوٹل کے احاطہ میں پہنچا ہی تھا کہ ایک اور موٹر اس کا تعاقب کرتی وہاں آ گئی اس موٹر سے کرنیل، نواز جنگ بہادر، کنور منصور احمد خاں، بڑی رانی جی اور نزہت بیگم اتریں۔ اور کرنیل صاحب نے اسے برآمدہ کی سیڑھیاں چڑھتے پا کر آواز دی۔

اجی صاحب، ذرا رک تو جائیے صبح سے آپ کے پیچھے چکر کاٹ رہے ہیں خدا کیلئے ہم پر رحم فرمائیے۔

اس نے مڑ کر دیکھا، اس کی آنکھیں ابھی تک آنسوؤں سے بھری تھیں۔ وہ ان سب کو دیکھ کر ایک دم رک گیا۔ منہ نیچے کی طرف کر کے آنکھیں پونچھنے کی کوشش کی اتنے میں وہ آن پہنچے تھے اور حیدرآبادی انداز میں تسلیمات بجا لا رہے تھے کرنیل صاحب نے شکوہ کیا۔

بھئی میاں رات آپ خبر دئیے اور ماحضر تناول فرمائے بغیر چلے آئے یہ آپ نے بالکل اچھا نہیں کیا۔

اس نے معذرت کی۔

کرنیل صاحب، مجھے رات منو کے متعلق کمانڈر انچیف سے آخری بات کہنی تھی۔ مجھے اسکے لیے احکام لینے تھے اگر میں رات یہ کام نہ کرتا۔ تو ممکن ہے صورت حال مخدوش ہو جاتی۔

نزہت نے انتہائی بے تابی سے اس کی بات کاٹ لی۔

تو کیا آپ نے احکام کے لیے کیا منو خطرہ سے بچ گئے

بریگیڈیئر نے نزہت کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

جی ہاں دونوں باتیں ہوگئیں۔ آج کی ہوائی ڈاک سے میجر منّو کے کمانڈنگ آفیسر کو ہر ضروری ہدایت بھیج دی گئی ہے۔ اور سفارش کی گئی ہے کہ چونکہ میجر منّو نے رینکز میں بھرتی ہوکر، انتہائی فرض شناسی اور غیر معمولی صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ اس لئے اس کی مناسب حوصلہ افزائی کی جائے اور اسے اجازت دی جائے کہ اگر وہ ایک آدھ مہینے کے لئے، وطن آنا چاہے تو آ سکتا ہے۔

نزہت کا جی چاہا، اس شخص کے پاؤں پر گر پڑے اور رو رو کر کہے۔

تو بہت دیر میں آیا۔ اگر تو پہلے مجھ سے ملا ہوتا۔ تو میں کنور منصور احمد خاں کی جگہ تجھ سے بیاہ کرتی۔

تو بہت اونچا آدمی ہے۔

یہ اونچا آدمی ابھی تک کہہ رہا تھا۔

میری آپ لوگوں سے درخواست ہے اگر منّو ہندوستان آئے، تو اسے اسکے حقوق واپس دے دیں اور اسے اجازت دیں کہ وہ زمرد بیگم سے نکاح کر لے۔

اس کی آواز ذرا اٹک گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے حلق صاف کیا۔

زمرد بیگم اتنی اونچی عورت ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ یقیناً ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئی۔ وہ یقیناً ایک معمولی آدمی کی بیٹی ہے۔ لیکن میں نے اس میں جو خوبیاں دیکھی ہیں۔ وہ ہر ایک کو میسر نہیں آتیں۔

آخر کی بات اس نے کنور منصور احمد خاں سے مخاطب ہو کر کہی۔

کنور صاحب، اس زمرد بیگم نے۔ صرف چند دن منّو کے ساتھ بسر کئے ہیں لیکن چند مہینے وہ اس منّو کے لئے اس طرح تڑپی ہے جیسے ہر لمحہ کانٹوں کی سیج پر بیٹھی تھی۔

نہ جانے یہ باتیں نزہت کے دل میں تیز نوکیلے بھالوں کی طرح کیوں چبھ گئیں۔ اس نے پھر سر اُٹھا کر، اس بریگیڈیئر سے کچھ نہیں پوچھا۔ اور جب وہ ان سب کو لئے ہوئے اپنے کمرے میں آیا اور صاحب داد خاں کو حکم دیا۔

ان کے لئے، کچھ لاؤ۔

تو نزہت، آپ ہی آپ کہہ اُٹھی۔

ہم کچھ نہیں پئیں گے۔ ہم تو آپ کا صرف شکریہ ادا کریں گے کہ آپ نے ہم سب پر اتنا بڑا احسان کیا جتنا کوئی دوسرا نہ کر سکتا۔

اس کی آواز میں کسی قدر تلخی تھی۔ بریگیڈیئر نے یہ تلخی محسوس کر لی اور رکوع کے بل جھکتے ہوئے تسلیمات بجا لایا۔

رانی جی نے اپنے دونوں ہاتھ اسکے گلے میں ڈال کر اسکی پیشانی چوم لی، اور بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا بیٹا۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا ہے کہ منّو اور منصور کی طرح تو بھی میری کوکھ سے پیدا ہُوا تھا۔

بریگیڈیئر کے دل کو یہ بات ایسی بھائی کہ وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔

اس اتنے اونچے افسر اور ۴۸ سال کے مرد کے لئے۔ اس طرح رونا، کچھ عجیب ہی بات تھی، مگر اس بات کے تجزیہ پر کسی کی نگاہ نہ تھی۔ سب، رانی جی کی بے تابی دیکھ رہے تھے وہ کبھی اس روتے بڑے افسر کی پیشانی چومتیں اور کبھی سر، خود ان کی آنکھیں پوری روانی سے بہہ رہی تھیں۔

نواں باب

شہزادی نزہت بیگم کو شملہ پہنچ کر کیا ہو گیا تھا۔ وہ روز بروز پیلی پڑتی جا رہی تھی۔

گو کنور صاحب، روزانہ صبح و شام، اسے اپنی کھلی موٹر میں بٹھا کر، میلوں ہوا خوری کیلئے لے جاتے اس کی دلجوئی کے لئے ہر بات کرتے۔ وہ کیا، شمیم پور کا ہر آدمی اس نزہت بیگم کے پاؤں تلے آنکھیں بچھاتا۔ مگر اس کے جسم کا گداز۔ اس کی آنکھوں کی چمک، اور چہرے کی رونق، آپ ہی آپ ختم ہوتی جا رہی تھی۔

اسے سوکناپے کی کوئی تکلیف نہ تھی کہ یہ سمجھا جاتا کہ اس جلاپے نے اسکے دل کو پکڑ رکھا ہے نہ اسے کوئی اور ظاہری دکھ تھا صبح شام ڈاکٹر اسکا معائنہ کرتے۔ مگر کوئی جسمانی نقص بیان نہ کر سکتے۔ گرمی البتہ یقیناً تھی۔ جون ختم ہو کر جولائی شروع ہو چکی تھی۔ مگر اس گرمی کا زور توڑنے کے لئے، نزہت بیگم کے سارے کمروں پر خس کے دُہرے پردے لگا دئے گئے تھے۔ یہ پردے ہر وقت پانی سے گیلے رکھے جاتے۔ اور اندر بجلی کے پنکھے، اس درجہ تیز ہوا پھینکتے کہ ایسا لگتا جیسے شمیم پور میں اس دفعہ گرمی نہیں پڑی۔

لیکن دلوں کا بھید کون جان سکتا ہے۔ نزہت بیگم کے دل کا حال بھی کسی کو معلوم نہ ہوا۔ اور اس دن تو اس غریب پر غشی کے دورے پڑنے لگے جب سورن۔ ایک لمبا چوڑا اجری تار لے کر شمیم پور آئی۔ اس کی اپنی آنکھیں روتے روتے سوج چکی تھیں۔ اس نے روتے روتے ہچکیاں لیتے لیتے یہ تار نزہت کے ہاتھ میں دے دیا۔ نزہت تار پڑھتے پڑھتے کئی بار بے ہوش ہوئی۔ اور جب تار مکمل پڑھ لیا تو سورن کے سینہ سے لگ کر بچوں کی طرح واویلا کیا۔

سورن، یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا، نہ میں زمرد بیگم کی توہین کرتی نہ منو بھاگ کر اوورسیز جاتا اور نہ اس کا انجام یہ ہوتا۔

تار میں کوئی حتمی بات نہ لکھی تھی صرف اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ

کس طرح میجر منو جنرل ہیڈ کوارٹر کی ہدایات کے بعد لفٹننٹ کرنیل بنا، اور پھر کس طرح وہ اپنی پوری ماتحت فوج کے ساتھ، برلن کے محاذ پر پہنچا۔ وہ کس بہادری سے لڑا اس نے کیسے کیسے کارنامے انجام دیے مگر ایک رات دشمن کی اتفاقیہ بم باری کے بعد کہیں دیکھنے میں نہ آیا۔ اور اب تک پوری جستجو کے باوجود لاپتہ ہے۔

یہ تار گھر بھر نے پڑھا۔ رانی جی نے پڑھا۔ کنور منصور احمد خاں نے پڑھا مگر کوئی بھی اس طرح نہیں تڑپا کوئی بھی اس طرح نہیں بلکا، اس طرح غشی میں مبتلا نہیں ہوا جس طرح یہ نزہت بیگم ہوئی۔ رانی جی تو خیر ماں تھیں۔ وہ اس صدمہ سے اگر مر بھی جاتیں تو کوئی کچھ کہنے والا نہ تھا۔ لیکن نزہت کے اس طرح رہ رہ کر طرح بے ہوش ہو ہو جانے سے تو کنور صاحب اور رانی جی کے سوا باقی ہر ایک کے دل میں ایک عجیب شبہ نے جگہ پکڑ لی، اور اب ہر کوئی ایک ہی بات کہنے لگا۔

یہ نزہت بیگم کے چہرے کی رنگت اس لیے پیلی پڑتی جا رہی ہے کہ وہ کنور صاحب کی بجائے منو کو چاہتی تھیں۔

یہی بات، ایک رات سلطان جہاں، کنور صاحب کی پہلی بیوی نے کنور صاحب کے گوش گزار کی۔ کنور صاحب غصہ سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اور سلطان جہاں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

یہ بات تم نے آج تو کہہ دی ہے آئندہ نہ کہنا۔

ورنہ۔۔۔۔۔

وہ اس سے آگے کچھ کہہ نہ سکے اور اپنے کمرے میں چلے آئے۔ مگر رات بھر یہ بات جلتے ہوئے انگارہ کی طرح ان کے دل و دماغ پر رکھی ان کے سکون کو جلاتی۔

رہی۔ وہ کتنی رات تک سو نہیں سکے۔ اور انتہائی بے تابی میں جب کبھی وہ نزہت بیگم کے کمرے میں آئے۔ نزہت بیگم سورن کے گلے میں باہیں ڈالے ایک ہی بات اس سے کہہ رہی تھی۔

سورن۔ منّو کی تباہی کا سبب میں ہوتی ہوں۔ یہ میں نے اسے جلتی آگ میں جھونکا۔

کنور صاحب سمجھتے۔ سلطان جہاں نے جو بات آج رات کہی تھی نزہت اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

وہ رات تو خیریت گئی۔ اس کے بعد جو راتیں پے در پے آئیں۔ ان میں کنور صاحب کو یقین ہوتا گیا۔ کہ نزہت بیگم ان سے نہیں منّو سے محبت کرتی ہے۔ نزہت اپنے حواس میں نہ تھی۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے، تو وہ جواب میں ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔ وہ اور [illegible] تو کچھ نہ کہتی۔ رشتہ کے اعتبار سے منّو کا تعلق کنور صاحب سے تھا۔ نزہت زیادہ سے زیادہ اس کی بھاوج تھی۔ مگر یہاں تو عالم ہی دوسرا تھا۔ وہ ہر لمحہ روتی چیختی، تڑپتی اور بلکتی۔ گھر کے لوگ حتیٰ کہ بڑی رانی جی بھی اعتدال پر آ گئیں۔ اور کنور صاحب سوچتے آخر، ان سب سے زیادہ منّو کے گم ہونے کا رنج اس نزہت کو کیوں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نزہت اور منّو نے چند سال اکٹھے گزارے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ ایک دوسرے شخص کی بیوی ہونے کے بعد اس کے لئے روئے۔ وہ منّو کے بھائی تھے، لیکن مرد ہونے کی حیثیت سے وہ بالکل غیر تھے۔ اور ان کی غیرت، یہ بات ایک لمحہ کے لئے برداشت نہ کر سکتی تھی کہ ان کی بیاہتا، بیوی، ہر لمحہ، ایک ایسے مرد کے لئے آنسو بہاتی اور آہیں بھرتی رہے جس نے اسے رد کر کے ایک دوسری عورت کو اپنا لیا۔

وہ سوچتے اگر اس نزہت کو منّو سے اس درجہ عشق تھا تو اس نے مجھ سے کیوں محبت کی۔ مجھ سے کیوں بیاہ کیا۔

اس فراڈ کی کیا ضرورت تھی۔

یہ تو وہ اب ایسی بات سوچ رہے تھے۔ اسے تو انہیں اس وقت سوچنا چاہیئے تھا جب انہوں نے نزہت پر محبت کے ڈورے ڈالنے شروع کئے تھے۔ جب صبح و شام وہ ہزار ہزار بہانوں سے نزہت کے حضور حاضر ہوتے۔ اور ہزار ہزار طریق سے اسے اپنی غیر فانی محبت کا یقین دلاتے اور اس سے کہتے۔ میری محبت۔ عام انسانوں کی کی طرح فانی نہیں۔ یہ تو وہ شعلہ ہے جو شروع سے آخر تک فروزاں رہتا ہے۔

اور اب یہ شعلہ بجھتا چلا جا رہا تھا۔ اب وہ اس نزہت سے نفرت کرنے لگے تھے جو ان کے گم شدہ بھائی کے غم میں اس طرح رو رہی تھی۔

ان کا جی سب سے زیادہ جس چیز سے جلا۔ وہ سورن کی آمد اور اسکی موجودگی تھی نزہت بیگم۔ ہر لمحہ اس دبلی پتلی، تیکھے نقشوں والی سورن سے الجھی رہتی۔ وہ کبھی اس کے گلے میں باہیں ڈال کر منّو کی باتیں کرتی کبھی منّو کی بچپن کی تصویریں۔ ایک البم سے نکال کر دوسرے میں دوسرے سے نکال کر تیسرے میں لگاتی رہتی۔

اگر سورن یہاں نہ آئی ہوتی۔ تو اول اسے اس بات کی خبر ہی نہ ہوتی۔ اور اگر خبر بھی ہو جاتی تو بھی وہ اتنا لمبا سوگ نہ مناتی۔

اور اس شام تو حالات عجیب صورت اختیار کر گئے۔ جب کنور صاحب نے نزہت سے درخواست کی کہ سورن کو واپس بھیج دو۔ اس کی موجودگی۔ میرے تمہارے تعلقات کو خراب کرنے میں مدد دے رہی ہے۔ نزہت نے ان کی یہ بات سنی تو بھاگتی ہوئی

باہر آگئی اور سورن کے گلے میں باہیں ڈال کر رانی جی اور گھر کے دوسرے لوگوں کی موجودگی میں پورے زور کے ساتھ چیخی۔

اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ یہاں ہم کو اتنی اجازت بھی نہیں کہ ہم اپنے ایک دوست کے غم میں رو سکیں۔ ایسے دوست کے غم میں جس کی مصیبت اور دکھوں کا باعث ہم تھے۔

اس خاندان کی روایات کی رو سے یہ کتنی بے ہودہ بات تھی جو نزہت بیگم نے کہی۔ رانی جی تک اس کا منہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں، اور کنور منصور احمد خان نے تو اس قدر رنج کیا کہ مکان کے اس حصہ سے اپنا بستر دوسرے حصہ میں بھجوا دیا۔

نزہت بیگم آپ غصہ میں تھی۔ اس نے اس رات سورن سے کہا۔

سورن۔ سچ مچ ہم یہاں نہیں رہیں گے ہم کسی کی قیدی نہیں ہیں۔ جلد و کبھی بھی سکیں۔

دوسری صبح، اس نے دہلی جانے کے لئے رخت سفر باندھا۔ مگر شمیم پور ہاؤس میں رخت سفر باندھنا آسان تھا روانگی آسان نہ تھی۔ یہاں وہ نظام رائج نہ تھا جس کی رو سے خاندان کے باقی افراد من مانی کر سکیں۔

اس دن نزہت اور سورن کے بستر بندھے کے بندھے رہ گئے۔ کسی ماما، کسی خادم اور کسی پہرہ دار نے ان کی مدد نہیں کی۔ اور جب وہ غصہ میں آن کر سارے سامان کو پیچھے چھوڑ کر اکیلی بھاگ جانے کے لئے۔ موٹر گیراج کے پاس آئیں تو پہرہ داروں نے انہیں گیراج کا دروازہ کھولنے نہیں دیا اور جب نزہت نے انتہائی غصہ میں دروازے پر اپنے نازک پاؤں زور زور سے مارے تو بدمعاش پہرہ داروں نے جو کل تک اس کے سامنے رکوع کے بل جھکتے۔ اس کی ہنسی اڑائی،

اور نزہت کا جی چاہا۔ وہ اپنا سر اس دروازے سے پھوڑ لے۔ سورن اسے سنبھال کر واپس لے گئی۔ اب سورن نے سیاست سے کام لیا۔ رانی جی سے مل کر درخواست کی نزہت بیگم تو آپ کی بہو ہیں، انہیں آپ نہیں جانے دیتی تو نہ جانے دیں۔ مگر میں تو یہاں ملنے آئی تھی مجھے جانے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی۔ رانی جی نے حیرت سے کہا۔

مگر بیٹی تمہیں تو کسی نے جانے سے نہیں روکا۔ تم جب چاہو جا سکتی ہو۔

مگر کنور صاحب کی اجازت کے بغیر سورن بھی شمیم پور ہاؤس سے نکل نہ سکتی تھی۔

کنور صاحب یہاں نہیں تھے شکار پر تشریف لے گئے تھے۔ کہیں دوسرے دن واپسی ہوئی تو بڑی رانی صاحبہ نے ان سے مل کر سورن کے لئے جانے کی رخصت مانگی وہ بہت غصہ میں تھے۔ انہوں نے ماں سے کہا۔

ماں اس سارے فساد کا باعث یہی عورت ہے۔ میں اسے اس کی اس حرکت کی سزا دئے بغیر اسے جانے نہ دوں گا۔

ماں نے سمجھایا!

بے وقوف ہو۔ وہ دہلی کے ایک بڑے سکھ گھرانے کی لڑکی ہے۔ اور اس کا بھائی بڑا افسر ہے۔ وہ تو اس جبر کے خلاف سخت احتجاج کرے گا۔

کنور صاحب، بہر حال کنور تھے گرجے۔

میں اس کے جبڑے توڑ دوں گا۔

ماں نے بات بنتی نہ دیکھ کر اسے کچھ نہیں کہا۔ اپنے کمرے میں آگئیں۔ بوا کرشن سے کہا چودھری رمضانی سے کہو بیل گاڑیاں تیار کرے ہم۔ آموں کے باغوں میں جائیں گے۔ یہ اس خاندان کی عام رسم تھی۔ جولائی۔ اگست دو مہینے تو ہر ہفتے اس کی

وجہ سے بڑی رونقیں رہتیں۔ پورے قصبہ کی طرح عورتیں۔ اس میں شریک ہوتیں چودھری کا رمضانی کریہ حکم بھجوا کر، رانی صاحبہ نے۔ اپنی مصاحب عورتوں کو، قصبہ میں بھیجا، اور پھر گھنٹے بھر میں ساری کوٹھی۔ قصبہ کی عورتوں سے بھر گئی۔ بیس کے قریب بیل گاڑیاں، اس قافلے کو سوار کرکے حویلی سے آموں کے باغوں کی طرف بڑھ رہیں۔ رانی جی کے ساتھ۔ نزہت بیگم سورن اور سلطان جہاں بھی تھی۔ گو سلطان جہاں دوسری بیل گاڑی میں لدی تھی، مگر۔ اس نے رانی صاحبہ کی دعوت بڑی خوشی سے قبول کی تھی۔

کنور صاحب، غصے میں لب گھولتے۔ کبھی ایک سگرٹ سلگاتے۔ کبھی دو سرا، اور ایک دو کش لے کر اسے پھینک دیتے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا۔ کہیں سے یہ منّو، ان کے ہاتھ آجائے اور وہ اس کے سر کے بال، ایک ایک کرکے نوچ کر پھینکیں۔

یہ میں نے تجھ سے کب کہا تھا تو نزہت بیگم کے بازو کو زخمی کرکے ایک دوسری عورت کے ساتھ بھاگ جاتا۔

انہیں منّو سے کوئی ایسی دشمنی نہ تھی۔ وہ اس سے اچھے خاصے قریب تھے اور عام رؤسا کے خاندانوں کے لڑکوں کی طرح انہیں اپنے اس بھائی سے کسی بات پر کوئی اختلاف بھی پیدا نہ ہوا تھا۔ منّو یوں بھی یہاں بہت کم رہا تھا۔ صرف پہلے چھ سال۔ ساتویں برس میں کرنیل صاحب زبردستی اسے اپنے ساتھ دہلی لے گئے تھے سال میں وہ ایک آدھ دفعہ ایک دو دن کے لئے شمیم پور آتا کنور صاحب کو یہ خوبصورت آنے جانے والا بھائی بہت بھلا معلوم ہوا کرتا۔ اور جب پندرہ سال کی عمر میں رانی جی نے زبردستی منّو کو شمیم پور بلا کر اس سے قرآن پر قسم لی کہ وہ اُنکی اجازت کے بغیر اپنی شادی نہیں کرے گا۔ تو کنور صاحب کا جی چاہا۔ ماں سے کہیں ماں جب منّو یہاں نہیں رہتا۔ جب منّو کو

کرنیل صاحب نے اپنا بیٹا بنا لیا ہے تو تم یہ خاندانی رسم کیوں اس پر ٹھونس رہی ہو مگر ماں نے اس سے نہ مشورہ لیا تھا نہ اسکے مشورہ کی پابند تھی۔ یہ تو اس کا اپنا حق تھا اور اس حق کو وہ اس کنواری کی خاطر چھوڑ نہ سکتی تھی۔

غصہ میں بھرے ہوئے کنور نے اپنی مونچھوں کو کئی بار اکھیڑ دینے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی ماں کی اس حماقت پر نفریں کی۔ اور سوچا، اگر ماں نے منّو سے اس قسم کی قسم نہ لی ہوتی۔ تو آج نزہت بیگم اس سے جھنتی۔ آج نزہت بیگم کا سلوک اس سے یہ نہ ہوتا۔

کنور صاحب، اب بھی اس لانبی لانبی آنکھوں والی نزہت سے محبّت کرنے کے لئے تیار تھے۔ اگر یہ نزہت ان کو یقین دلادیتی کہ وہ ان کے سوا کسی دوسرے کی نہیں ہے مگر یہ نزہت تو کسی اور کی ہوتی جارہی تھی۔ یہ تو ان کی نہ رہی تھی۔ یہ تو ان کے بھائی کے فراق میں زمین آسمان سر پہ اُٹھائے تھی۔ اس بھائی سے وہ انتقام تو نہ لے سکتے تھے۔ البتہ ایک ہی چیز بس میں تھی کہ وہ اسکی یاد اس گھر سے مٹا دیں۔ اس خیال سے بھاگتے بھاگتے نزہت کے کمرے میں آئے منّو کی وہ ساری تصویریں جو نزہت نے مختلف البموں میں لگا رکھی تھیں، ایک ایک کرکے پھوڑ دیں اور ان کے ٹکڑے باہر ہوا میں اُڑا دئے۔ منّو کی کئی اور نشانیوں کے ساتھ بھی انہوں نے یہی سلوک کیا۔ یہاں تک کہ اس گھر میں منّو کی ایک یادگار بھی نہ رہ گئی۔

کافی اندھیرا ہوئے۔ جب بیل گاڑیاں گھنگھرو بجاتیں اور شور مچاتیں بڑی حویلی میں داخل ہوئیں تو کنور صاحب، سلطان جہاں کی بیٹھک میں سارے پردے گرائے، اپنی ایک منہ لگی نائن کے ساتھ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔

بیل گاڑیوں کے شور سے سوتی حویلی جاگ اٹھی۔ قہقہوں، کے طوفان اُٹھے اور

سلطان جہاں، اپنی منہ لگی خادمات کے [illegible] ہوئے قدم اٹھاتی۔ اپنے سونے کے کمرے میں آئی۔ ناگن، بھاگ چکی تھی اور کنور صاحب شراب کے نشے میں جھوم رہے تھے سلطان جہاں آئی تو کنور صاحب نے، اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور منہ لگی خادمات مسکراتی اپنی کوٹھریوں کی طرف بڑھ گئیں۔

سلطان جہاں آج بہت خوش تھی آج اس نے اپنی روتی بلکتی سوکن کو، آپ اپنی آنکھوں سے روتے دیکھا تھا، آج وہ سارا دن، قصبہ کی جوان عورتوں کیساتھ مل کر خوب گائی اور خوب ناچی تھی۔ اور اس سارے وقفہ میں نزہت جہاں بیگم ایک ہی جگہ پر بیٹھی روتی رہی تھی۔ سلطان جہاں کے لئے یہ بات کم مسرت بخش نہ تھی، اسکا تو جی سارا دن یہ چاہتا رہا تھا۔ پورے قصبہ میں بوندوں کے لڈو بانٹے۔ آج اس کی سوکن سرعام رسوا ہوئی تھی۔ آج اس سے شوہر ایسی بڑی نعمت چھیننے والی ناگن آپ اپنے زہر سے ڈسی گئی تھی۔

سلطان جہاں، کئی بار اپنی منہ چڑھی خادمات پر آم اچھالتی۔ انہیں اس کونے میں ہانک لائی جہاں نزہت بیگم اکیلی بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ وہ سورن کبھی پاس نہ تھی جس نے دہلی سے آن کر سلطان جہاں کے دل کی مراد پوری کی تھی۔ سلطان جہاں کا جی اس سورن کو ملنے کو بہت چاہا۔ اسے بڑی خوشی ہوتی اگر یہ سورن اسے آج ملتی۔ وہ اس سے کہتی۔

تم گو میری نہیں، میری سوکن کی سہیلی ہو۔ مگر تم نے وہ کام کیا ہے۔ جو میں برسوں کی جدوجہد پر کر نہ سکی۔ تم نے میرا چھنا ہوا شوہر مجھے واپس دے دیا ہے۔

یہ سورن پورا دن اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ اور جب بڑی رانی صاحبہ سے سلطان جہاں نے اس سورن کے متعلق پوچھا، تو انہوں نے ادھر ادھر دیکھ کر بڑی بے تعلقی سے کہا۔

چھوڑو اس کو وہ نہیں آتی تو نہ سہی۔

مگر وہ چھوڑنا نہ چاہتی تھی۔ وہ اس سے ملنے کی بڑی آرزو مند تھی۔ اور اس وقت بھی جبکہ کنور صاحب نے شراب میں مخمور ہو کر اور دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔ وہ یہی چاہ رہی تھی کہ کسی طرح اس سورت سے مل سکے۔ اس نے کنور صاحب سے اپنی ساری جوانی اپنی آنکھوں میں بھر کر اپنی یہ خواہش کہہ دی۔

کنور صاحب نشہ میں تھے اس سلطان جہاں کی یہ معمولی سی خواہش سن کر قہقہہ مار کر ہنسنے کہنے لگے۔ ارے یہ کون ایسا بڑا کام ہے۔ کہو تو میں ابھی اسے تمہارے حضور پکڑ لاؤں سلطان جہاں نے محض کہا ہی نہیں اصرار بھی فرمایا۔ کنور صاحب جھومتے ہوئے، اٹھے۔ اور باہر کو لپکے۔ وہ سیدھے نزہت کے کمرے میں گئے وہاں نزہت نے ایک طوفان مچا رکھا تھا۔ وہ فرش پر گری ایڑیاں رگڑ رہی تھی اور بڑی رانی صاحبہ اور خادمات حیران تھیں، اسے کمرے میں پہنچتے ہی اچانک یہ کیا ہو گیا ہے اسے جو ہو گیا تھا اس کا علم کنور صاحب کو خوب تھا اور وہ اس، ایڑیاں رگڑتی نزہت کی بے تابی اور بے قراری کا تماشہ بڑی دلچسپی سے ملاحظہ فرما رہے تھے انکے شرابی دماغ کو اس مغرور اور بے وفا کا یوں ایڑیاں رگڑنا اور تڑپنا بہت بھلا معلوم ہوا۔ ان کا جی چاہا۔ زور زور سے قہقہے ماریں اور کہیں۔

ہم نے وہ تمہارے سارے کھلونے توڑ ڈالے جن سے تم ہم سے چھپ کر دل بہلاتی تھیں بے وفا عورت کی سزا یہی ہے۔ کہ وہ تمہاری طرح تڑپے اور ایڑیاں رگڑے۔

وہ نہ جانے کب تک دروازے پر کھڑے اس قسم کی مہمل آرزوئیں کرتے رہتے کہ رانی صاحبہ نے انہیں دیکھ لیا، اور بہت بے تابی سے چیخیں۔

یہ تم وہاں کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ یہاں کیوں نہیں آتے۔

مگر وہ آگے نہیں بڑھے۔ رانی صاحبہ غصہ میں بھر گئیں۔ نزہت کا سر اپنی ایک خادمہ کی گود میں رکھ کر اپنی جگہ سے اُٹھیں۔ اور کنور صاحب کے پاس آکر انہیں ڈانٹا۔

معلوم ہوتا ہے۔ یہ کوئی تم نے شرارت کی ہے۔ بہو۔ تمہاری کسی حرکت کے سبب یوں تڑپ اور بلک رہی ہے۔

کنور صاحب شرابی تو تھے زور سے ہنسے اور بک پڑے۔

جی ہاں۔ یہ ہم نے اس بے وفا عورت کے کھلونے توڑ دیئے ہیں یہ ہمیں بھول کر ہر وقت انہیں کھلونوں سے کھیلتی رہتی۔

رانی صاحبہ نے حیرت اور غصہ کے ملے جلے احساس کے ساتھ پوچھا۔

یہ تم نے کیسے کھلونے توڑ دیئے ہیں۔ یہ بے چاری کھلونوں سے کب کھیلتی، یہ تو ہر وقت روتی رہتی ہے۔

کنور صاحب پہلے کی طرح ہنستے ہوئے کہنے لگے۔

یہ منّو کے بچپن کی تصویریں اس کے لئے کھلونے ہی تو تھیں۔ میں نے یہ سب پھاڑ کر پھینک دی ہیں۔ تاکہ نہ بانس رہے اور نہ بنسری بجے۔

رانی صاحبہ ماں تھیں۔ منّو ان کا بیٹا تھا۔ گم شدہ بیٹا اور اسکی بچپن کی تصویریں ان کے لئے ویسی ہی عزیز تھیں جیسے ہر ماں کے لئے عزیز ہو سکتی ہیں۔ وہ دل پکڑ کر جہاں کھڑی تھیں وہیں بیٹھ گئیں۔ پھر بے تحاشہ اپنا سر پیٹنے لگیں۔ اور شرابی کنور صاحب پہلے ہی کی طرح قہقہے لگاتے، واپس ہو گئے۔ وہ اس نئے تماشہ میں اُلجھ کر بھول ہی گئے تھے یہاں کس لئے آئے تھے۔ انہیں تو یہ بات اسی وقت یاد آئی جب سلطان جہاں نے انہیں سورن کے بغیر لوٹتے دیکھ کر پوچھا۔

ارے آپ اس سورن کو کو ساتھ نہیں لائے۔

انہوں نے، دماغ پر تھوڑا سا زور دینے کے بعد جواب دیا۔

ہاں میں اسے تو نہیں لایا۔ لیکن۔ وہاں ایک بڑا دلچسپ تماشہ دیکھ کر آیا تھا۔

وہ نزہت بیگم زمین پر گری ایڑیاں رگڑ رہی ہے۔ بال نوچ رہی ہے اور چیخ چیخ کر رو رہی ہے۔

پھر ذرا وہ جوش میں آ گئے۔

میں نے منّو کی وہ ساری تصویریں آج پھاڑ دی تھیں جن سے وہ ہر وقت کھیلتی رہتی۔

عورت کی بینائی نے سلطان جہاں کے کان میں اچانک ایک خوفناک بات کہہ دی

یہ کنور صاحب، ابھی تک اس عورت سے پہلے ایسی محبت کرتے ہیں۔ یہ ابھی تک اس کی محبت اپنے دل سے نکال نہیں سکے۔ سلطان جہاں بھاگی بھاگی اپنے لباس خانہ میں گئی اور سب سے بہتر اور کنور صاحب کا سب سے مرغوب لباس پہنکر پھر ان کے پاس آگئی کنور صاحب پھر شراب سے جی بہلانے لگے تھے اور سلطان جہاں، ان کی گود میں آگئی۔ کنور صاحب اس طرح بیٹھ گئی جیسے وہ ان کی کوئی ساقی عورت تھی۔

دسواں باب

بریگیڈیر لقمان اس نزہت کی طرح نہ عقومردلا تھا اور نہ کم حوصلہ۔ اس نے اپنے لئے جو زندگی انتخاب کی تھی وہ اس سے مطمئن تھا، وہ زیادہ سے زیادہ کام کرتا، ہر لمحہ سفر پر رہتا، مہینے کے ۴ دن چھوڑ کر۔ باقی چھبیس دن، دوروں میں کاٹتا۔ اس نے۔ ہر تقریب

چھوڑ دی تھی۔ ہر دلچسپی سے منہ موڑ لیا تھا، شراب تک منہ سے نہ لگاتا۔ اور کبھی کبھی جب زینو اسکی اس کھچی کھچی اور کھوئی کھوئی طبیعت دیکھ کر پوچھتی۔

یہ آپ میں کیسی تبدیلی آ گئی ہے۔

وہ جواب میں تلخی سے مسکرا پڑتا۔ وہ اس زینو سے کہتا۔ زینو یہ تبدیلی میں نے آپ اپنے اندر پیدا نہیں کی، یہ تو آپ ہی آپ پیدا ہو گئی ہے۔ آدمی پر کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے جو مجھ پر آیا ہے۔

زینو حیران ہو کر سوچنے لگتی۔ ان پر یہ کون سا وقت آ گیا ہے۔ بریگیڈیئر ہیں پورے ریکروٹنگ ایریا کے افسر اعلیٰ ہیں، ہزاروں آدمی روزانہ سلامیں کرتے ہیں لاکھوں آدمیوں کی قسمتیں ان کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ اس سارے اختیار کے باوجود، بریگیڈیئر لقمان کا دل ایک ایسی عورت کے لیے تڑپ رہا تھا جو دوسرے کی تھی جو ان کی نہ ہو سکتی تھی۔ اور جس کی ایک ادنیٰ ادا پر انہیں اختیار نہیں تھا۔

کبھی کبھی۔ زینو، بریگیڈیئر لقمان کی اس پریشانی سے آپ پریشان ہو جاتی اور سوچتی اگر اسے معلوم ہوتا۔ یہ بریگیڈیئر اس قسم کی خشک زندگی کے عادی ہیں تو وہ کبھی ان کے ساتھ نہ آتی۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ ان کی طفیل سب لفٹننٹ ہو گئی تھی اور دو چار ہفتوں میں فل لفٹننٹ ہونے والی تھی۔ لیکن لفٹننٹ ہونے سے، اس کی بڑی عادتیں تو نہ چھوٹ سکتی تھیں۔ وہ متواتر کئی سال سے شراب پینے، اور کپتانوں اور میجروں کے ساتھ رات رات بھر غائب رہنے کی عادی تھی۔ اور یہاں آن کر اس نے تین مہینے سے نہ ایک گھونٹ شراب پی تھی اور نہ جنسی کشش کی تسکین پائی تھی وہ اس خشک

زندگی۔ وہ اس صوفیانہ ماحول کو یقیناً برداشت کر لیتی اگر بریگیڈیئر لقمان۔ اس پر مترنم ہوتا۔ بریگیڈیئر لقمان تو نہ جانے کس پریشانی میں الجھ گیا تھا۔ اس نے تو کبھی اس سے مسکرا کر بات نہیں کی کبھی اسکے لباس پر تنقیدانہ نگاہ نہیں ڈالی کبھی یہ نہیں کہا تمہارے یہ کھلے بال اچھے نہیں لگتے تمہاری آنکھوں کے سیاہ دوڑے کیوں پہلے سے سیاہ ہوتے جا رہے ہیں۔ یوں یہ صحیح تھا۔ بریگیڈیئر لقمان کبھی کبھی ہفتہ عشرہ کے بعد اس کے پاپا کے پاس بڑی نیازمندی کے ساتھ حاضر ہوتا پچاس سو روپے کی چیزیں بھی نذر کرتا کئی تھان لٹھے ململ اور دوسرے کپڑے کے خرید کر آپ ہی آپ بھجوا دیے تھے۔

مگر یہ تو محض رسمیات تھیں یہ تو ظاہر داری تھی۔ بریگیڈیئر لقمان نے کبھی کبھی ان تین مہینوں میں زینو کو اپنے بنگلہ پر بلا کر مسکرا کر، یا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھا تھا۔ کبھی بھی رات کو شراب پینے اور کچھ دیر ٹھیرنے کی خواہش نہیں ظاہر کی تھی۔ اور ایک شام تو زینو نے جان بوجھ کر چٹھیاں ٹائپ کرنے میں دیر لگا دی تھی۔ اس کی خواہش تھی دن چھپ جائے۔ اور بریگیڈیئر صاحب اس سے کہیں۔ اگر کام زیادہ ہو تو آج رات یہیں رہ جاؤ۔ مگر جیسے ہی سورج غروب ہوا تھا بریگیڈیئر لقمان سگرٹ کا دھواں اڑاتا اسکے پاس آیا۔ اور حکم دیا۔

اب گھر چلی جاؤ۔ باقی کام کل کرنا۔

اس نے منہ بنا کر کہا بھی۔

کل تو صبح ہی دورے پر جانا ہوگا۔ یہ کام کہیں رہ نہ جائے۔

اس نے پہلے کی طرح دھواں اڑاتے ہوئے جواب دیا۔

کوئی بات نہیں۔ اگر یہ کام نہ بھی ہوا تو نہ تم کو نوکری سے جواب ملیگا نہ مجھے۔

یہ بہت تلخ جواب تھا۔ زینو کاغذات وہیں چھوڑ کر، سلام کئے بغیر، باہر آئی۔ بریگیڈیر نے دھواں اُڑاتے اُڑاتے صاحب داد خاں کو پکارا۔

مس صاحب کو گھر چھوڑ آؤ۔

زینو کو دکھ تو بہت ہوا لیکن وہ بریگیڈیر لقمان سے کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ فرشتوں سے آدمی کبھی خوش نہیں رہتا۔ مگر ان کو کوس بھی نہیں سکتا۔

بریگیڈیر لقمان اس زینو کے لئے محض فرشتہ تھا۔ محض ایک محسن، محض ایک نیک آدمی وہ ان کی نیکی، احسانات اور شرافت کی تعریف کر سکتی تھی مگر اسے نہ اوڑھ سکتی تھی اور نہ کسی دوسرے کام لا سکتی تھی۔ اسے اس سے عشق نہ تھا نہ محبت تھی۔ اس کا جی ضرور چاہتا۔ وہ اسے راتوں کو اپنا ساتھی بنا سکے۔

مگر بریگیڈیر میں شائد، ایسی کسی بات کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ یا اس نے ان باتوں سے توبہ کر لی تھی کہ ادھر متوجہ ہی نہ ہوا۔ اور زینو کی جوانی پر اوس پڑتی رہی۔

جس دن زینو فل لفٹنٹ بنائی گئی۔ اور ایک کی بجائے دو اسٹار اس کے کندھوں پر چمکے۔ اس دن بریگیڈیر لقمان نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ اسے چائے کی دعوت دی۔

پانچ بج چکے تھے۔ وہ دونوں چائے پی رہے تھے۔ ابھی آدھی آدھی پیالی اپنے حلق سے نیچے اتری تھی کہ صاحب داد خاں نے بہت ادب کے ساتھ جھک کر اطلاع دی،

سرکار، بیگم صاحبہ، سوجی سوجی آنکھوں اور زرد زرد گالوں کے ساتھ دروازہ پر کھڑی ہیں۔ اور اندر آنے کی اجازت چاہتی ہیں۔

زینو کو ایسا لگا جیسے اس کے کندھوں پر لگے اسٹار کسی نے اچک لئے ہیں اس کی وردی پھاڑ دی ہے۔ اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی ہے۔

بریگیڈیئر لقمان پر اس سے بالکل مختلف اثر ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی، چھوٹ کر فرش پر اوندھی ہو گئی، اس کا جسم کانپنے لگا تھا اور آنکھیں فرطِ حیرت سے کھلی رہ گئی تھیں۔

صاحب داد خاں اس اچانک تبدیلی کے سبب سے آگاہ نہ تھا، البتہ یہ ضرور جانتا تھا صاحب اس بیگم صاحبہ سے عجیب طرح کی محبت کرتے ہیں۔ ایسی محبت جس کو سمجھنے سمجھانے کی اسے اہلیت حاصل نہ تھی۔

بریگیڈیئر لقمان، کچھ دیر کانپنے اور لرزنے کے بعد، بہت آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ شرابیوں کی طرح قدم اٹھاتا، باہر آیا۔ باہر زمرد بیگم، برآمدہ کے ستون کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ زرد، بال پریشان، آنکھیں چڑھی ہوئیں اور جسم انتہائی لاغر تھا۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، دونوں کی آنکھیں بڑی مدت کے بعد، ایک دوسرے سے دو چار ہوئیں اور نہ جانے ان دونوں کو کیا ہوا۔ دونوں ایک ساتھ رونے لگے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کچھ بھی تو نہیں کہا یہ بھی نہیں پوچھا۔

مزاج کیسے ہیں، کیسی گزری ہے۔

وہ تو خیر باہر سے آئی تھی۔ وہ تو کچھ کہہ نہ سکتی تھی یہ تو بریگیڈیئر کا فرض تھا اس سے کہتا۔ تم نے مجھ غریب کے تاریک خانہ تک تکلیف کی۔ تم نے مجھے اپنی تشریف آوری سے نوازا میں کس منہ سے شکریہ ادا کر دوں۔

مگر اس نے ایسی کوئی بات نہ کہی۔ اور دیوانوں کی طرح کھڑا اسے دیکھتا اور آنسو بہاتا رہا۔ یہ تو صاحب داد خاں نے فرض شناسی سے کام لیا اور زمرد بیگم کے سامنے جھک کر درخواست کی۔

سرکار اندر تشریف لائیے باہر کیوں رکی کھڑی ہیں۔

ان دونوں نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور دونوں آپ ہی آپ اندر کی طرف بڑھے پہلے زمرد اندر داخل ہوئی اور پھر لقمان نے قدم بڑھائے اور اندر ایک اور احمق مخلوق بیٹھی تھی۔ زمرد بیگم کی نگاہ اس پر اٹھی۔ تو اس کا جی چاہا مسکرائے اور بریگیڈیئر لقمان سے کہے۔

آپ نے اچھا کیا وقت کاٹنے کے لیے ایک دلچسپی پیدا کرلی۔

لیکن جب اس نے مسکرانا چاہا تو مسکرا نہ سکی۔ البتہ اس زینو نے جو زرد زرد چہرے کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی کسی قدر مسکرا کر اس کا خیر مقدم کیا۔ اور صوفہ سے کسی قدر ہٹتے ہوئے درخواست کی

تشریف رکھیئے۔

اس نے یہ الفاظ کہہ تو دیے۔ مگر اسے اپنے حواس پر قابو نہ تھا اور اس کا دماغ ایک عجیب قسم کے الجھاؤ میں الجھا سوچ رہا تھا۔

یہ بیگم صاحبہ، اعلیٰ حضرت کی بیوی ہیں، شائد دونوں ایک دوسرے سے ناراض تھے، کسی سبب سے علیحدگی اختیار کرلی تھی لیکن اب، بیگم صاحبہ کسی بڑی مجبوری کے سبب، ہار مان کر تشریف لے آئی ہیں۔ یوں تو بڑی کیٹلی، بڑی رعنا اور بڑی حسین ہیں۔ لیکن غم نے شوہر کی جدائی نے، اور شائد غربت نے بے حال کر دیا ہے

زینو اسی قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں سوچ رہی تھی۔ کہ زمرد صوفہ پر دھم سے گر پڑی زینو نے سوچا منزل پر پہنچ کر تھکے ہارے مسافر نے ہمت ہار دی ہے۔ زینو یہ وقت نہیں جانتی تھی کہ اس تھکے ہارے مسافر کی یہ منزل نہ تھی اس کی منزل تو اس پر گم ہو گئی تھی۔

بریگیڈیئر لقمان پر سکتہ کا عالم طاری تھا۔ اس سے اتنا بھی نہ ہوا کہ وہ آگے بڑھ کر، اس زمرد بیگم کو اوپر اُٹھاتا، زینو کو یہ کام کرنا پڑا۔ اس نے زمرد کو نہ صرف اوپر اٹھایا بلکہ اسے صوفہ کی پشت کے سہارا بٹھا کر، اس کے کندھے، اس کی باہیں، اور ہاتھ کتنی دیر تک ملے۔ پھر اسے گھونٹ گھونٹ کر کے گرم چائے پلائی۔ اس پورے وقفہ میں وہ بریگیڈیئر لقمان جو اس پورے ریکروٹنگ ایریے کا افسر اعلیٰ تھا، یہ عالم پھٹی آنکھوں اور سوئے ہوئے دماغ کے ساتھ دیکھتا رہا۔ اس نے اپنی جگہ سے ذرا بھی تو جنبش نہ کی۔ البتہ صاحب داد خاں نے کافی مستعدی دکھائی، بیگم صاحبہ کے پاؤں سے جوتے اُتار کر، پاؤں دابنے لگا تھا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہہ رہا تھا۔

کوئی بات نہیں بیگم صاحب، ہر مصیبت ختم ہو جاتی ہے ہر دکھ اپنی انتہا کو پہنچ کر، اپنی شدت کھو دیتا ہے۔

جب وہ یہ کہہ رہا تھا، زمرد بیگم سوچ رہی تھی مگر ابھی اس کی مصیبت تو انتہا کو نہیں پہنچی ابھی تو ٹھیک طور پر اس کا آغاز ہوا ہے۔ ابھی تو اس کی منزل اس پر گم ہوئی ہے، ابھی تو اس نے راستہ بھولا ہے۔ یہ بات اس نے صاحب داد خاں سے جب رُک رُک کر کہی تو زینو حیران رہ گئی، اس کے ہاتھ، عجیب طرح کا پنے لگے۔ مگر زمرد بیگم کہے جا رہی تھی۔

صاحب داد خاں! ابھی ایک ہفتہ بھی تو نہیں ہوا، جب مجھے ان ظالموں نے خبر دی ہے کہ میری دنیا کا آفتاب ڈوب گیا۔

صاحب داد خاں وہ دور تھے! وہ سمندر پار بھیج دئے گئے تھے۔ لیکن مجھے یہ اُمید تو تھی کہ وہ کسی نہ کسی دن آئیں گے۔ ہمارا یہ عارضی فراق ایک دن ختم ہو جائے

اور وہ مجھ سے کہیں گے۔

زمرد، یہ تو محض ایک ہلکا سا امتحان تھا۔

لیکن اب صاحب داد خان۔ وہ مجھ سے کبھی یہ بات نہ کہہ سکیں گے۔

ان لڑائی چھیڑنے والے خود غرض انگریزوں نے جنہیں جرمن جہازوں کی بڑھتی ہوئی طاقت بھی نہ معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایک بحری تار بھیج کر مجھ سے ہمدردی کی۔ بہت افسوس ہم اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کہہ سکتے۔ کرنل شمس کریم خان بہادر اور دشمن [illegible] وہ دشمن کے بحری بیڑوں کی اچانک گولہ باری کے بعد سے لاپتہ ہیں۔

ان کی نعش کہیں نہیں ملی۔

زمرد کی آواز کسی قدر کانپ گئی۔ مگر اس نے اس کپکپی کے باوجود بات جاری رکھی۔

صاحب داد خاں! تمہارے صاحب نے ان پر اور مجھ پر بڑا کرم کیا تھا انہیں ایک جرم سے بچانے کے لئے سمندر پار بھیج دیا تھا۔ اور مجھ سے کہا تھا۔ ان پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔

اس کی آواز پہلے سے تیز ہو گئی۔

مگر اب میں ان سے پوچھنے آئی ہوں۔

اس بحری تار کا مقصد کیا ہے کیا وہ بریگیڈیئر ہوتے ہوئے مجھے بتا سکتے ہیں کہ ان کے انگریزوں نے۔ میری دنیا کی یہ روشنی مجھ سے کیوں چھینی۔ میرے دل کے آفتاب و مہتاب کو موت کی بدلی میں کیوں چھپا دیا۔ وہ خود کیوں نہ چھپ گئے؟
اس کی آواز پہلے سے بھی بلند ہو گئی۔

صاحب داد خان، یہ لڑائی انگریز کی تھی، یہ یقیناً اس قوم کی زندگی اور موت کا سوال تھا لیکن مجھے، یا میرے ملک کے دوسرے افراد کو اس سے کیا تعلق۔

صاحب داد خان!

میں تمہارے صاحب سے پوچھتی ہوں، انہوں نے کس برتے پر کس [illegible] مقصد کے لئے راجپوتانہ سے ایک لاکھ ہندوستانی بھرتی کئے۔

اور اب اس پنجاب اور اس سرحد سے نہ جانے کتنے اور آدمی لے [illegible] کیا، انہوں نے ایک لمحے کو یہ بات کبھی نہیں سوچی؟

کہ ان کی اس حرکت سے [illegible] اپنی ہر زندگی کھو دے گا، اپنے [illegible] قیمتی متاع سے محروم ہو جائے گا۔

وہ دفعتاً گرجیں۔

میں پوچھتی ہوں صاحب داد خان!

آخر تمہارے صاحب، اپنے ملک سے یہ غداری کیوں کر [illegible] کیا اس لئے کہ ان کا دل سہاگنوں کے سہاگ، ماؤں کے لال، اور بوڑھے باپوں کا سہارا چھینے بغیر مطمئن نہیں ہوتا۔ انہیں خون چوسنے کی بیماری ہو گئی ہے۔

وہ کہے جا رہی تھی اور بریگیڈیئر نعمان کے چہرے سے خون کی ہر بوند ختم ہو رہی تھی جب وہ آخری الفاظ پر پہنچی، تو بریگیڈیئر نے بہت زور کی سانس لی اور جو اب تک کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ زمرد بیگم نے۔ اس ساری تقریر کے دوران میں [illegible] کی طرف دیکھا،

[illegible] کی زبان رک گئی، پھر اس نے ایک لفظ نہیں کہا۔

زینو اور صاحب داد خاں، صاحب کو سہارا دے کر، اسے، اس کے کمرے میں لے گئے۔

زینو اب وہی عمل بریگیڈیئر لقمان کے ساتھ کر رہی تھی جو تھوڑی دیر پہلے، زمرد بیگم کے ساتھ کیا تھا۔ وہ کبھی اس کے بازو دباتی۔ کبھی ہاتھ!

صاحب داد خاں، برانڈی کی بوتل اٹھا لایا، ایک چھٹانک کے قریب برانڈی گلاس میں انڈیلی اور صاحب کو حکم دیا۔

صاحب یہ پی لو۔

صاحب نے یہ حکم مان لیا، اور برانڈی کی پوری چھٹانک حلق سے اتار لی،

اور وہ جس نے یہ سارا ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔ باہر بیٹھی، آنسو بہا رہی تھی۔

لقمان سنبھلا، تو اس نے صاحب داد خاں سے کہا۔ بی بی کو اندر لے آؤ، بی بی بغیر کسی احتجاج کے اندر آ گئی۔ تو لقمان نے، ان دونوں کے سامنے۔ زمرد کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے ــــــ زمرد نے ان جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا۔

اور بچوں کی طرح روتے ہوئے کہا۔

لقمان صاحب! میں آپ کو پریشان کرنے نہیں آئی تھی۔ صرف آپ کو اطلاع دینا مقصود تھا۔ کہ آپ کے دوست جن کے ساتھ آپ نے، اپنی جوانی کا بہترین دور گزارا۔ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

یہ کہہ کر، منہ پھیرا اور باہر کو لپکی۔ لقمان کے ضبط کی طنابیں ٹوٹ گئیں۔ وہ بھی اس کے پیچھے لپکا۔ وہ دونوں ہوتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے چلتے رہے نہ زمرد بیگم نے اسے تعاقب سے روکا اور نہ کوئی اور بات ہی کہی۔

ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر، اس نے۔ لقمان کی طرف دیکھے بغیر۔ دہلی کا ٹکٹ خریدا

اور پلیٹ فارم پر آ گئی۔

گاڑی آنے میں ابھی آدھ گھنٹے کی دیر تھی۔ لقمان نہیں جانتا تھا یہ ظالم کہاں جا رہی ہے مگر اس کے حواس کچھ اس طرح کھو گئے تھے کہ اسے کچھ جاننے کا ہوش ہی نہ تھا۔ البتہ وہ دونوں جوڑے ڈرتے ڈرتے اس سے تھوڑے فاصلے پر آن کھڑے ہوئے تھے بے ہوش نہ تھے زینو بے ہوش تھی اور شاید صاحب داد خاں۔ زینو تو خیر۔ زمرد بیگم سے یہ توقع نہ تھی۔ صاحب داد خاں کو تو اس [illegible] خوب موقع حاصل تھا۔ وہ لپکا پلیٹ فارم پر آیا۔ اور قریب قریب روتے ہوئے درخواست کی۔

آپ جانتی ہیں! اگر آپ اس طرح چلی گئیں۔ تو صاحب زندہ نہیں رہیں گے۔

زمرد بیگم نے اسے اس طرح دیکھا جیسے یہ بات کسی اجنبی کے متعلق کہی گئی تھی۔ اور پھر پوری تلخی سے جواب دیا۔

جب تمہارے صاحب نے لاکھوں ہندوستانی نوجوانوں کو اس ملک کے انتہائی قیمتی جوہر کو سمندر پار بھیجا تھا کیا یہ سوچا تھا کہ وہ زندہ نہیں رہیں گے۔

اس کی آواز پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔

پھر میں کیوں سوچوں۔ تمہارے صاحب کو میرے جانے سے کیا دکھ ہو گا۔

اس نے اچانک صاحب داد خاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کے جھکے ہوئے چہرہ پر اپنی نیلی نیلی آنکھیں گاڑ کر بات جاری رکھی۔

صاحب داد خاں! مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ تمہارے صاحب۔ مجھے بہت چاہتے ہیں۔ اور انہوں نے اسی لئے متو کو سمندر پار بھیج دیا تھا کہ میں۔ ان کی محبت کا جواب دینے کے لئے خالی ہو جاؤں۔

اس نے صاحب داد خاں کو دونوں کندھوں سے پکڑ لیا۔ اسے بہت زور سے جھنجھوڑا اور پھر نیچے ریلوے لائن کی طرف دھکیل دیا۔

اس کی یہ حرکت دیوانوں سے کم نہ تھی۔ لیکن شائد وہ ابھی پوری طرح دیوانی نہیں ہوئی تھی۔ ابھی ہوش باقی تھے۔ وہ آپ بھی اس کے پیچھے کود دی۔ اور اسے زمین پر سے اس تیزی سے اُٹھایا جیسے، یہ محض حادثہ ہُوا تھا۔

گرنے سے بے چارے صاحب داد خاں کی پیٹھ اور گردن کی ہڈی پر اچھی خاصی چوٹ آئی تھی۔ گردن میں شائد کوئی ٹھیکرا چُبھ گیا تھا کہ خون بھی بہنے لگا تھا۔ مرد اپنے دوپٹہ سے اس کی گردن سے خون بھی پونچھتی جاتی اور رو رو کر اس سے کہتی بھی جاتی۔

صاحب داد خاں ہمیں معاف کر دو۔ ہم ہوش میں نہ تھیں۔

صاحب داد خاں بڑا موقعہ شناس تھا۔ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنا نقصان کر لیتے ہیں، لیکن دوسرے کو بھی صاف نکل جانے نہیں دیتے۔ اس نے یہ موقع غنیمت جانا۔ اور بی بی کے پاؤں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر التجا کی۔

بیگم صاحب یہاں سے نہ جائیے۔ یہیں رہ جائیے۔ یہاں میں آپ کی خدمت کروں گا۔ یہاں میں روز آپ سے اسی طرح مار کھاؤں گا۔ آپ روز اسی طرح یہ خون بہاتی رہئیے گا۔ میں کبھی احتجاج نہیں کروں گا۔

مجھ سے قسم لے لیجئے بیگم صاحب!

اور یہ بیگم، بڑی زبردست احمق تھیں۔ اس کی اس درخواست سے اس درجہ متاثر ہوئی کہ ٹکٹ جمپر میں سے نکال کر دو ٹکڑے کر دیا۔ اور صاحب داد کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر، بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ بولی۔

صاحب داد خاں ۔ اچھا ہم تمہارے ساتھ رہیں گے ۔ لیکن شرط یہ ہوگی ۔ تمہارے صاحب ہمارے ہاں نہ آئیں ۔

صاحب داد خاں ہر شرط کے لئے تیار تھا ۔ وہ زمین سے اُٹھ کر اسی پٹڑی پر بچوں کی طرح ناچنے لگا ۔ پلیٹ فارم پر جو لوگ یہ عجیب تماشہ دیکھ رہے تھے ۔ اس پاگل کو ناچتے پاکر بہت زور زور سے ہنسنے لگے ۔ بریگیڈیر صاحب نے بہت غصے کے ساتھ ان ہنسنے والوں کو دیکھا وہ سب ان کے کندھوں پر لگے نشانوں اور سر کی ٹوپی پر لگے سرخ فیتے کو دیکھ کر مرعوب ہو گئے ۔

زینو کا جی چاہا ۔ صاحب سے کہے ۔ آپ انہیں غصے سے اس طرح کیوں گھور رہے ہیں ۔ یہ بیچارے غلط تو نہیں ہنس رہے ۔ میرا آپ جی چاہ رہا ہے ۔ میں آپ کے اس احمق اردلی پر جو حوالدار ہونے کے باوجود سخت قسم کا احمق ہے ۔ خوب زور زور سے ہنسوں ۔ مگر زینو جانتی تھی یہ حوالدار صاحب داد خاں احمق نہ تھا ۔ یہ اس نے ناچ ناچ کر اس احمق زمرد بیگم کی رہی سہی مداخلت ختم کر دی تھی اور وہ جو ہواؤں پر اُڑ رہی تھی ۔ اس طرح ٹھنڈی پڑ گئی تھی ۔ جیسے صاحب داد خاں نے ناچ ناچ کر اس کے چاروں طرف برف کے ہمالیہ اتنے اونچے تودے کھڑے کر دئے تھے ۔ یہ تو پلیٹ فارم کے انچارج سب انسپکٹر پولیس ، ادھر آن نکلے اور حوالدار صاحب داد خاں کو پکارا ۔

اجی حوالدار صاحب ! ذرا ناچ روک کر باہر تشریف لے آیئے ۔ گاڑی کا سگنل ہونے والا ہے ۔

سب انسپکٹر کی نگاہ ، بریگیڈیر صاحب پر ابھی نہیں اُٹھی تھی اس نے آخری لفظ ادا کئے ہی تھے کہ بریگیڈیر صاحب کو دیکھا ۔ اور بڑے ادب سے پورے

فوجی طریق سے سیلوٹ مارا۔

بریگیڈیئر نعمان اس ایریے کا سب سے بڑا افسر تھا۔ اور یہ اسٹیشن جس پر وہ کھڑا تھا۔ اس علاقہ کا سب سے بڑا اسٹیشن حویلیاں تھا۔

حوالدار صاحب داد خاں، پلیٹ فارم پر چڑھ آیا۔ بیگم صاحبہ کی طرف ہاتھ پھیلا کر انہیں بھی اوپر کھینچا۔ اور بریگیڈیئر نعمان نے اس زمرد بیگم کو بالکل اسی طرح ادب سے سلامی دی جس طرح ابھی ابھی سب انسپکٹر پولیس نے بریگیڈیئر صاحب کو دی تھی۔

سب تماشائیوں کی نگاہیں، حیرت و استعجاب کے ساتھ اس بیگم کو گھیرے تھیں جسے اس علاقہ کا سب سے بڑا فوجی افسر یوں سلامی دے رہا تھا۔ اور یہ عورت شائد آسمان سے اتر کر آئی تھی اس نے بریگیڈیئر نعمان کے سلام کی اتنی بھی پروا نہ کی تھی جتنی ایک سو لہ روپے کے سپاہی کی کی جاتی ہے۔ اس نے اس کی طرف دیکھا بھی تو نہیں۔ اور بڑے غصے کے ساتھ منہ پھیر کر، تیز تیز قدم اٹھاتی ویٹنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ صاحب داد خاں پیچھے لپکا۔

بریگیڈیئر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ اور تماشائیوں کے چہرے سوگوار ہو گئے۔ وہ سمجھے اور جا بجا سمجھے۔ بیگم صاحبہ۔ جن سے بڑے صاحب۔ بہت بری طرح محبت کرتے ہیں۔ صاحب کو جوتے پر بھی نہیں لکھتی۔

زینو کا تو جی چاہ رہا تھا اس بڑے صاحب کی حماقت اور بے غیرتی پر زور زور سے روئے۔ جس کی بے عزتی یوں بر سر عام ہوئی اور جس نے اس بے عزتی پر ذرہ برابر احتجاج نہیں کیا۔ اور ان دونوں کے پیچھے یوں چل پڑا تھا جیسے ان کا پالتو کتا تھا۔

احمق نہ تھو نہیں جانتی تھی ۔ مردوں پر کبھی ایسے وقت بھی آتے ہیں جب انکی حیثیت پالتو کتوں سے بھی بڑی ہو جاتی ہے ۔ زنیو یہ حقیقت جان بھی کیسے سکتی تھی ۔ اس نے تو کبھی ایسے مرد دیکھے نہ تھے ۔ وہ تو بے چارے آپ کپتانوں ، میجروں اور دوسرے افسروں کے پیچھے کئی سال سے پالتو کتوں کی حیثیت سے نہیں پالتو بلی کی حیثیت سے میاؤں میاؤں کرتی پھری تھی ۔ یہ تو بریگیڈیئر لقمان نے اسکے معیار زیست کو اچانک بلند کر دیا ۔ نہ جانے کیا بات تھی ۔ زنیو کی نگاہ میں بریگیڈیئر لقمان کو آج سے پہلے تک جو احترام نصیب رہا تھا ۔ وہ ہوا ہو گیا ۔ زنیو نے بڑی کراہت کے ساتھ اپنا خوبصورت سنہرے بالوں والا سر جھٹکا ۔ اور پلیٹ فارم کے بالکل مخالف سمت چلنے لگی ۔ اسٹیشن کا جو عملہ بریگیڈیئر صاحب کی اس سیکرٹری سے واقف تھا ، اس نے دل ہی دل میں سوچا ۔ یہ عورت رقابت کی آگ کا شکار ہو گئی ہے ۔

مگر جس عورت کی یہ رقیب تھی ، اسے کچھ خبر ہی نہ تھی ۔ وہ زنانہ ویٹنگ روم کی ایک آرام کرسی پر گری ۔ سامنے کھڑے صاحب داد خاں سے کہہ رہی تھی ۔

صاحب داد خاں تم اگر یہ ۔ دیکھنا چاہتے ہو تو ہمیں یہاں رہنے کیلئے کوئی الگ مکان لے دو ۔

صاحب داد خاں ابھی کچھ جواب نہ دے پایا تھا کہ بریگیڈیئر لقمان نے اندر قدم رکھے اور رکوع کے بل جھکتے ہوئے عرض کیا ۔

مکان تو آپکو جتنے آپ چاہیں ، مل جائیں گے ۔ لیکن ۔ میرے غریب خانہ پر کون رہے گا ۔ یہ شمع اگر وہاں نہ چلی ۔ تو میں ساری دنیا کے چراغ بجھا دوں گا ۔

زمرد شائد پھر پہلے ہی عالم میں پہنچ چکی تھی ۔ تلخی سے جواب دیا ۔

یہ کام تو آپ خدا کے فضل سے پہلے ہی سے کر رہے ہیں ۔ آپ نے نہ صرف میری

دنیا تاریک کی۔ آپ نے ہندوستان کے لاکھوں گھر بے چراغ کئے۔ کیا اب بھی آپکا جی نہیں بھرا۔

بریگیڈیئر نعمان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور کانپتے جسم اور پریشان دماغ کے ساتھ باہر نکل گیا

صاحب داد خاں نے صاحب کے جاتے ہی، ماہر شکاری کی طرح جال پھینکا۔

آپ نے خدا کی قسم صاحب کو خوب جواب دیا۔ صاحب کا یہ بھرتی کا کام مجھے بھی ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

انہوں نے سچ مچ، لاکھوں گھر ویران کر دئے ہیں۔ لاکھوں کڑیل جوان۔ بھرتی کر کے لام پر بھیج دیئے ہیں اور کون جانے ان میں سے کتنوں کے پاؤں یہ دھرتی پھر چوم سکے گی۔

اسکی آواز بھر آگئی۔ تصنع سے نہیں۔ حقیقی غم سے۔ اسکا اپنا ایک بھائی جسے صاحب ہی نے بھرتی کر کے لام پر بھیجا تھا۔ وہ بیٹھے ہوئے کام آگیا تھا۔ بھائی کی یاد نے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر دیں۔

اور زمرد کو تو محض رونے کا اشارہ چاہیئے تھا۔ وہ یوں روئی جیسے کبھی روئی نہ تھی۔

وہ رات زمرد بیگم نے مقامی رسٹ ہاؤس میں کاٹی۔ سونا تو خیر تقدیر میں نہ تھا۔ رات بھر آہیں بھرتی اور آنسو بہاتی رہی۔

صبح صاحب داد خاں، اسٹیشن سے کوئی آدھ میل کے فاصلے پر واقع ایک مختصر سے بنگلے میں اسے لے گیا۔ یہ بنگلہ ایک ریٹائرڈ صوبیدار میجر کا تھا۔ اس کے قریب اس کا اپنا مکان تھا۔ صاحب داد خاں نے۔ یہ بنگلہ دس روپے ماہوار پر کرایہ کیلئے لے لیا۔ اور کوئی نہیں جانتا اس نے۔ مالک مکان کو دو سال کا کرایہ کیوں پیشگی ادا کیا اور یہ رقم کہاں سے آئی۔

یہ زمرد بیگم کی زندگی کا نیا رخ تھا اور وہ ایک تارک الدنیا۔ فن کی طرح اس زندگی کو اپنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

گیارھواں باب

وہ دوسری عورت جس کا نام نزہت جہاں بیگم تھا اور جو دہلی کے بڑے رئیس سر وجاہت عالم مرحوم کی اکلوتی بیٹی اور وارث تھی نزہت شاید وجاہت ہیں۔ پھر ایسی تھی سورن کی سازش اور کرنیل نواز جنگ بہادر کی مداخلت سے اسے شمیم پور ہاؤس سے بھاگ نکلنا پڑا تھا۔ کرنیل صاحب، بذاتِ خود شمیم پور گئے تھے اور اس نزہت کو اپنے ساتھ یہاں لائے تھے اور آتے ہوئے انہوں نے کنور کو دھمکی دی تھی۔ اگر تم نے دہلی آ کر میری اس بچی سے ہزار ہزار معافی نہ چاہی تو خدا کی قسم میں تم پر فسخ کا مقدمہ کر دوں گا۔ یہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے یہ وہ لڑکی ہے جس کے پاؤں میں کہکشاں بچھ سکتی ہے۔

کنور نے غصے سے منہ پھیر لیا تھا۔ جواب میں ایک حرف بھی تو نہیں کہا تھا۔

بڑی ایک لمبی کہانی ہے۔ نزہت بیگم کے غم کی نہ جانے کیا صورت تھی۔ وہ ایک دن گھر چھوڑ گئی۔ اور جب سورن نے، ایک لامذہب سے جو کرسچن نیم عیسائی۔ نیم مسلمان۔ نیم ہندو تھا۔ سول میرج کا اہتمام کر لیا، تو نزہت نے اس کی مانگ میں سیندور بھرتے ہوئے اپنی لال لال آنکھوں سے کتنے ہی آنسو اس مانگ میں ٹپکا دیئے۔ سورن کی ماتا جی نے اسے آنسو بہاتے دیکھ کر پوچھا۔

بیٹی یہ خوشی کے موقع پر آنسو کیسے بہانے لگی ہو۔

نزہت نے جواب دیا۔

ماتا جی! میرے یہ آنسو دعا کے آنسو ہیں۔ میں اس سورن کے لئے بھگوان سے سکون کی بھیک مانگ رہی ہوں۔ میں چاہ رہی ہوں، اس کی یہ شادی مسرتوں کی

پیش خیمہ ہو کہیں یہ میری طرح تمام روگ نہ پال لے۔

سورن یہ سن کر کانپ اٹھی اور منہ اونچا کر کے اس نزہت کو دیکھا جو اس دنیا میں منو کے بعد اس کی سب سے بڑی دوست تھی۔ اس کی آنکھیں بہہ رہی تھیں سورن اپنی آنکھوں کی زردی، بہت کم ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہا۔ نزہت سے کہے۔

نزہت کوئی بات نہیں یہ مزہ تو نے بھی دیکھا۔ یہ تجربہ تو نے بھی کیا۔ مجھے بھی کر لینے دے۔

یہ بات اس نے اس سے نہیں کہی۔ ولیم سلیم اچانک آن دھمکا۔ اور پوری بے قراری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

کبھی عدالت لنچ کے لیے اٹھ جائے گی اور یہاں ابھی آپ تیار ہی نہیں ہو پائیں

نزہت نے جلدی جلدی آنسو پونچھے سورن کی پیشانی پر ٹیکا لگایا۔ سونے کی پٹی پہنائی اور اوڑھنی اوڑھا کر اپنے سہارے نیچے لائی موٹر منگوائی اور ولیم سلیم سے کہا آپ اپنی موٹر میں پہلے چلیں ہم پیچھے پیچھے آئیں گے۔

عدالت میں معمولی کارروائی کے بعد ولیم سلیم اور سورن میاں بیوی بنا دیے گئے واپسی پر سورن ولیم سلیم کی موٹر میں چڑھی اور نزہت اکیلی اپنی موٹر میں بیٹھی۔ وہ سوچنے کے عالم میں نہ تھی۔ سوچنے کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں وہ بے طرح کھوئی کھوئی سی تھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے آج کوئی اچھی بات نہیں ہوئی آج اس سورن نے منو کی موت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے آج منو کی یہ یادگار بھی اس سے چھن گئی ہے۔ آج وہ اس تسلی سے بھی محروم ہو گئی تھی۔ (کنواری) سورن کا وجود بھی تو ایک یادگار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسے نزہت جب بھی دیکھتی اسے منو آپ ہی آپ

یاد آجاتا۔ اور وہ سورن کے گلے میں باہیں ڈالکر اس منو کی باتیں کرنے لگتی، مگر اب یہ سورن کسی دوسرے کی ہو گئی تھی۔ سورن نے ایک ایسے شخص سے رشتہ جوڑ لیا تھا جو نزہت کے طبقہ کا نہ تھا۔ جس سے نزہت زیادہ میل جول نہ رکھ سکتی تھی۔ گویا اس شخص سے سورن کی شادی کرنے کے معنیٰ یہ تھے کہ منو کے بعد سورن بھی گئی۔

نزہت نے موٹر بنگلہ پر واپس لے جانے کی بجائے۔ نہ جانے کیوں آج کئی دن کے بعد نواب زادی سلمیٰ رحمٰن کے گھر کا رخ کیا۔ سلمیٰ رحمٰن برآمدہ میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ جب نزہت تیز تیز موٹر چلاتی اس کے قریب آن کر رکی۔ موٹر کی آواز سے سلمیٰ رحمٰن چونکی۔ اور نزہت کو موٹر سے اترتے دیکھ کر کچھ اس طرح خوش ہوئی جیسے انتیس دن کے روزے رکھنے کے بعد اس نے عید کا چاند دیکھ لیا تھا۔ یہ نزہت اس کے لیے عید کا چاند ہی تو ہو گئی تھی۔ مگر یہ چاند کتنا مرجھایا مرجھایا سا تھا اس کی رنگت کتنی زرد تھی سلمیٰ رحمٰن نے اس سے بڑی بے تابی سے لپٹنے کے بعد یہی بات کہی۔

میری جان۔ میں تو سمجھی تھی شادی تمہارے حسن میں اضافہ کر دے گی یہ کلی پھول بن جائے گی۔ مگر یہ کوئی الٹی بات ہی ہو گئی ہے۔

نزہت اس سے کیسے کہتی۔

سلمیٰ الٹی بھی ایسی ہوئی ہے کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

سلمیٰ اسے لپٹائے لپٹائے اندر لے آئی اور آپا کو آواز دی۔

آپا! یہ نزہت دلہن آئی ہیں۔ ذرا کسی سے کہو۔ ان کیلئے سنگترہ نکار سنکال لائے

پھر نزہت سے متوجہ ہو کر شکوہ کیا

نزہت خدا کی قسم۔ تم تو بڑی ہی بے وفا نکلیں، شادی آخر سبھی کی

ہوتی ہے۔ تمہاری شادی تو بالکل انوکھی ہوئی۔ چار مہینے کوئی تھوڑی مدت نہیں ہوتی۔ مگر تم نے ان چار مہینوں میں ایک خط تک نہ لکھا۔ قسم لے لو، میں ہر شام تمہاری ممی کو باقاعدہ ٹیلیفون کر دیتی۔ ظالم ہر بار ایک ہی جواب دیتی۔۔

بی بی نے کوئی خط نہیں لکھا۔

نزہت شکوے سننے نہ آئی تھی، اس نے تو سلمی کے گھر کا رخ اسلئے کیا تھا کہ یہاں پہنچ کر، اس دکھ کو کسی قدر کم کر سکے جو نسرین کی شادی سے اسے پہنچا تھا۔ ویسے بھی سلمی شکووں کے دفتر کھول کر اسے کچھ پریشان کئے دے رہی تھی۔ اس کا جی چاہا سلمی کو بڑبڑ کرتے چھوڑ کر، باہر نکل جائے اور اپنی موٹر کو دیوانہ وار دوڑاتی کسی ایسی جگہ جا پہنچے جہاں کوئی شکوہ کرنے والا نہ ہو۔

مگر سلمی کو چھوڑنا آسان نہ تھا۔ سلمی تو اس سے یوں لپٹ گئی تھی جیسے اس کا ارادہ جان گئی ہو۔ اور اس سے لپٹ کر، اس کی آنکھوں کو دیوانہ وار چومتے ہوئے پھر وہی بات دہرائی۔

اری نزہو۔ یہ تیرے گال زرد کیوں ہو گئے ہیں یہ تیری آنکھوں میں ایسی خوفناک گہرائی کیوں پیدا ہو گئی ہے۔

پھر خدا جانے اسے آپ ہی آپ منو کیسے یاد آگیا۔ اور اس نے نزہت کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر، بہت بدلی بدلی آواز میں پوچھا۔

اری کچھ منو کا پتہ چلا۔

پرسوں بریگیڈیئر آفتاب احمد کہہ رہے تھے۔ منو کے متعلق جنرل ہیڈ کوارٹر کو جو نئی تفصیلات پہنچی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ یار محمد [illegible] منو، اپنی

موٹر میں سوار ہو کر کہیں باہر جا رہا تھا اس کی موٹر اس کے کمپ سے کوئی میل بھر کے فاصلے پر خالی کھڑی ملی ہے۔

موٹر میں سے کچھ خطوط بھی برآمد ہوئے جو کسی زمرد بیگم نے اسے ہندوستان سے لکھے تھے۔

خطوط کا یہ پلندہ، ہیڈکوارٹر کو پہنچ گیا ہے۔

اس خبر نے نزہت کے چہرہ پر، ایک عجیب نور پھیلا دیا تھا اور وہ انتہائے مسرت میں سلمیٰ کے گلے میں باہیں ڈال کر کہہ رہی تھی۔

تو منو بم باری سے مرا نہیں۔ وہ بچ کر نکل گیا ہے۔

او میرے اللہ۔

یہ کہہ کر، نزہت نے، سلمیٰ کا متھہ بے اختیار چوم لیا اور اسے اوپر کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

سلمیٰ تم نے یہ اتنی خوش کی بات مجھے سنائی ہے کہ میرا جی چاہتا ہے میں تیرے ساتھ مل کر دیوانہ وار ناچوں۔

سلمیٰ نہ جانے کس عالم میں تھی۔ اچانک، پوچھ لیا۔

اری اگر تجھے منو سے اتنی محبت تھی۔ تو پھر تو نے، کنور سے شادی کر، کی پھر تو نے۔ اپنے اس محبوب کا انتظار کیوں نہ کیا۔

نزہت ابھی کچھ جواب نہ دے پائی تھی کہ سلمیٰ نے آپ ہی جواب بھی دے دیا۔

ارے میں بھولی، تم لوگ جس قسم کی محبت کرتی ہو اس میں سوگ نہیں منایا جاتا۔ اس میں آہیں نہیں بھری جاتیں۔

اس نے رُخ بدلا۔

اس ظالم سورن نے بھی تو اس دیم سیلم سے محبت کی پینگیں بڑھا لی ہیں۔

اگر ایسا ہی تھا تو بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں کیا بُرے تھے۔ تو نے بے وقوف کمو کی بجائے ان ہی سے شادی کر لی ہوتی بے چارے کل آئے تھے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

میں نے پوچھا بھی کیوں نزہت جہاں یاد آئی ہیں۔

منہ پھیر کر آنسو پونچھ لیے اور اسی وقت چلے گئے۔ ایک وہ ہیں نزہت اور ایک تم ہو۔ خدا کی قسم جاؤ ہم تم سے خوش نہیں ہیں۔

نزہت کو اس کی خوشی اور ناراضگی کی پروا نہیں تھی وہ ایک ایسے عالم حسرت میں تھی جہاں ستاروں کی شمعوں اور بجلی کے قمقموں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

اس نے تو اس سلمیٰ کی یہ بکواس سنی تک نہ تھی۔ اور منو کے ساتھ گزاری ہوئی گھڑیوں کو ایک ایک کر کے یاد کرتی جا رہی تھی۔ نزہت نے سلمیٰ کے اس احتجاج کی پروا نہ کی تو اس نے اس کے بازو میں بہت زور کی چٹکی لی اور ڈانٹا۔

ارے یہ تم کہیں سے بھنگ پی کر آئی ہو کہ پینک میں کچھ سنتی ہی نہیں میں کب سے بک رہی ہوں۔ اور بکتے بکتے گلا تک خشک کر لیا ہے۔

نزہت نے بے ساختہ اس کا منہ چوم لیا۔ میری جان! سلمیٰ تو بڑی اچھی ہے بڑی پیاری اور بڑی میٹھی ہے۔

تو نے مجھے ایسی خوشی کی بات سنائی کہ میں سب کچھ بھول گئی ہوں۔

سلمیٰ اپنا ہر شکوہ بھول گئی اور نزہت کو سینہ سے بھینچتے ہوئے کہنے لگی۔

سچ بتا نزہو کیا تجھے اب بھی منو سے محبت ہے۔ اب بھی تو اسکو چاہتی ہے اور اگر وہ تجھے اب بھی مل جائے تو کیا تو ــــ

نزہو نے اس سے آگے اسے کچھ کہنے نہیں دیا اور اس کا منہ بند کر دیا۔

ابھی وہ دونوں اس عالم میں تھیں کہ بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں میجر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کمرے میں آن داخل ہوئے۔ دونوں کے لئے نزہت کی موجودگی اچنبھے سے کم نہ تھی۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نزہت کو دیکھا۔ سلمیٰ چیخی۔

ارے یوں آنکھیں کیوں پھاڑ رہے ہو۔ یہ میری نزہت ہی تو ہے۔ پورے چار مہینے کے بعد ادھر آئی ہے۔

نزہت نے ان دو پرانے ساتھیوں کو اتنے دنوں کے بعد دیکھا، تو ہر پچھلا خیال فراموش کر کے تسلیمات بجالائی۔

اور پھر شکووں شکایتوں کے دفتر کھل گئے۔ بریگیڈیئر صاحب کو سب سے زیادہ اس بات کا رنج تھا کہ نزہت نے انہیں آخر وقت تک اندھیرے میں رکھا۔ انہوں نے سلمیٰ کو جج بنا کر اس سے اپیل کیا۔

سلمیٰ تم ہی انصاف کرو۔ کہ جب یہ مجھ سے نفرت کرتی تھیں تو انہوں نے ہر موقعہ پر منافقت کیوں برتی۔ کیوں میری حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔

نزہت نے بات کاٹ لی!

میں نے بریگیڈیئر صاحب کبھی آپ سے نفرت نہیں کی۔ یہ اور بات ہے۔ میں نے آپ سے نکاح نہیں کیا، آپ کو اپنا شوہر نہیں بنایا۔ بریگیڈیئر صاحب۔ آپ نہیں جانتے۔ اس میں ایک بڑا راز تھا۔

بریگیڈیئر صاحب نے اعتراض کیا۔

مگر یہ راز منو کے بھائی کنور صاحب سے بیاہ کرتے وقت کیوں راز نہ رہا۔

نزہت نے اپنی خوبصورت زرد زرد آنکھیں، بریگیڈیئر صاحب کی آنکھوں

میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

کنور صاحب سے میری شادی، ابھی تو ایک راز ہے۔ افسوس میں، یہ راز ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہوں۔

اچانک سلمیٰ نے۔ نزہت کو سینہ سے لگا لیا۔ اور اس کی طرف سے وکالت کی۔

بریگیڈیئر صاحب، نزہت سچ کہتی ہے۔ یہ کوئی راز ہی ہے۔ ورنہ۔ شادی کے بعد، بے چاری اس قدر مرجھا نہ جاتی، اس کے گلاب کے پھولوں جیسے رخسار زرد نہ پڑ جاتے۔ اس کی سیاہ مست آنکھیں۔ اپنی سرمستی سے محروم نہ ہو جاتیں۔

یہ تو بریگیڈیئر صاحب جانتے تھے کہ نزہت، اپنے چہرے کی زردی، اپنی آنکھوں کی بے رونقی کے باوجود، اب بھی ملکہ جہاں ہے، اب بھی وہ اسکے پاؤں پر سجدے کرنے کو تیار ہیں۔

مگر سلمیٰ نے جو بات کہی تھی۔ وہ بھی حقیقت سے بعید نہ تھی۔ اسے بھی جھٹلایا نہ جا سکتا تھا۔ نزہت کی صحت پہلے کی نسبت بہت خراب تھی۔ اور بریگیڈیئر صاحب نے، کسی قدر پشیمانی کے ساتھ کہا۔

مجھے سلمیٰ بہن اس کا احساس ہے۔ اور میں بدنصیب اگر کسی خدمت کے قابل سمجھا جاؤں تو میری بڑی ہی خوش نصیبی ہو گی۔

خدا جانتا ہے سلمیٰ اگر ان کی صحت کی بحالی کے لئے مجھے اپنے جسم کا سارا خون بھی دینا پڑے تو میں دریغ نہیں کروں گا!

یہ کہتے وقت، ان کی آواز کسی قدر بھرا گئی۔ اور سلمیٰ نے بڑی حسرت کے ساتھ ان کو دیکھا جو اتنے بڑے عہدیدار ہونے کے باوجود، نزہت کی جوتیوں کے لیئے۔

اپنی چمڑی پیش کر رہے تھے۔ سلمیٰ نے ابھی تک کسی سے محبت نہ کی تھی بڑی بے فکری لڑکی تھی۔ بریگیڈیئر صاحب کی اس بات کو سن کر بڑی شوخی سے مسکرائی۔ اور نزہت کے بازو میں چٹکی لیتے ہوئے پوچھا۔

اری نزہو۔ خدا کی قسم یہ تو مجھے آج معلوم ہوا، تجھ میں کتنے جوہر ہیں کہ ایسے ایسے بڑے آدمی تیرے نازک پاؤں میں اپنی چمڑی کی جوتیاں پہنانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

نزہت۔ اس وقت ہنسنے کے عالم میں نہ تھی۔ بریگیڈیئر کی اس بات نے تو اس احمق کو ایک اور دنیا میں پہنچا دیا تھا اور وہ سوچنے لگی تھی۔ اس نے کنور صاحب سے شادی کر کے بڑی غلطی کی۔ اس نے جو چاہا وہ نہ ہو سکا۔ اور معاملات پہلے سے زیادہ اُلجھ کر رہ گئے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو وہ نہ ادھر کی رہی تھی اور نہ اُدھر کی۔ اس بے بسی کے خیال نے نزہت کے چہرے کو اور زیادہ پژمردہ کر دیا۔ اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ بے رونق ہو گئیں۔

سلمیٰ نے، ان باتوں کا اُلٹا اثر دیکھا تو نزہت کو خود سے لپٹا لیا۔ اور معذرت کی۔

میری جان، یہ میں نے تجھے رنج پہنچانے کی بات نہ کی تھی، اس سے تجھے رنج پہنچا تو مجھے معاف کر دے۔

سلمیٰ کی معذرت نے نزہت کے غم کو اُچھال دیا۔ اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ اس موضوع پر پھر کسی نے بات نہیں کی۔ اور تھوڑی دیر بعد جب نزہت اُٹھ کر جانے لگی تو بریگیڈیئر صاحب نے التجا کی۔

اگر ناگوار خاطر نہ ہو۔ تو میں اپنے ڈاکٹر کو آپ کے ہاں بھیج دوں، تاکہ آپکو دیکھ لے۔

نزہت کی بیماری جسم کی نہ تھی روح کی تھی۔ وہ کسی ڈاکٹر کی محتاج نہ تھی اس نے بریگیڈیئر صاحب کی اس درخواست کا جواب دیا۔

بریگیڈیئر صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مگر میں کوئی بیمار نہیں ہوں کہ ڈاکٹر کو تکلیف دوں۔

بریگیڈیئر صاحب نے اضطراب کا اظہار کیا۔

پھر یہ آپ اس طرح زرد زرد کیوں ہیں۔

نزہت کیوں زرد تھی وہ بریگیڈیئر صاحب سے کیا کہتی۔ اس زردی کے اسباب تو اسے آپ ابھی تک اچھی طرح معلوم نہ ہوئے تھے وہ تو آپ یہ نہ سمجھ پائی تھی کہ اس کی صحت کیوں گرتی جا رہی ہے۔ اس نے بریگیڈیئر صاحب کو ٹال دیا۔

ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے۔ جب، دل کا غم چہرے پر جھلک آتا ہے۔

بریگیڈیئر صاحب نے پوچھا،

تو کیا آپ اس شادی سے سکھی نہیں ہیں۔

یہ نزہت کا ذاتی معاملہ تھا، اس نے بریگیڈیئر سے یہ بات کہہ دی۔ اور بریگیڈیئر صاحب سوچنے لگے۔ کیا کبھی وہ گھڑی نہیں آسکتی جب نزہت کا ذاتی معاملہ، ان کا ذاتی معاملہ ہو جائے۔ یہ امید۔ تو وہ کبھی کی اپنے دل میں پال رہے تھے۔ مگر اس کا جو انجام ہُوا تھا وہ ان کو معلوم تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں، وہ آپ ہی آپ سوچنے لگے۔ نزہت کی یہ شادی، ناکام رہی ہے۔ ہو سکتا ہے۔ یہ ٹوٹ جائے۔ اور جب یہ ٹوٹ جائے گی تو وہ پھر امیدوار بن کر نزہت کے حضور حاضر ہوں گے۔ آدمی نے ہمیشہ اپنے آپ کو اسی قسم کے فریب دئے ہیں۔ بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں

نے بھی اپنے آپ کو یہ نیا فریب دیا اور جب نزہت سلمیٰ کے سہارے، اپنی موٹر تک آئی، تو وہ بھی ساتھ آئے، تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اور جب وہ موٹر میں بیٹھ گئی تو اُسے اس طرح سیلوٹ مارا جیسے نزہت ان کی افسرِ اعلیٰ تھی۔

اس دن کے بعد سے انہوں نے یہ معمول بنا لیا۔ وہ نزہت کے ہاں بڑی باقاعدگی کے ساتھ جاتے۔ وہ اُٹھتی وہ اس کے ساتھ اُٹھتے۔ اس کیلئے دروازہ کھولتے، اس کے لئے ریڈیو کا بٹن دباتے۔ اسے اخبار پڑھ کر سناتے۔ اس کیلئے تاش کے پتے گنتے۔ اور کبھی کبھی سلمیٰ کو اُکسا کر، اسے سینما لے جاتے۔

سلمیٰ کے سوا، اور کوئی ایسا نہ تھا جس سے نزہت کا دل بہلتا۔ نجم کو چھوڑ کر جتنی نوکرانیاں اس بڑے گھر میں، پرورش پا رہی تھیں، ان میں سے آدھی سے زیادہ نزہت کے پیچھے ہی رخصت ہو گئی تھیں۔ باقی کو نزہت نے آپ جواب دے دیا۔ مرد ملازموں میں۔ البتہ پہرہ دار، مالی، باورچی، بیرے اور ڈرائیور حسبِ دستور رہتے۔ اور ان سے نزہت کو کوئی دلچسپی نہ تھی، کبھی کبھی تو نزہت کا جی چاہتا، اتنے بڑے بنگلہ کو بیچ کر، کوئی مختصر سا مکان، کسی آباد محلے میں بنا لے۔ اور وہیں زندگی کے دن گزارے۔ اس بے چینی کی زندگی میں ایک اور دکھ شامل ہو گیا تھا۔ وہ حمل سے تھی۔ اور اس شخص کا بچہ جننے والی تھی، جس سے اسے خطرناک قسم کی نفرت ہو گئی تھی، ایک دن تو اس کا یہ دُکھ اس درجہ بڑھا کہ وہ لیڈی ڈاکٹر کو بلا لائی اور اس کو ہزار ہزار خوشامد سے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس بچہ سے اسے نجات دیدے۔ لیکن یہ تو نجم نے۔ زمین آسمان سر پر اُٹھا لیئے۔ یہ تو نجم نے سخت خطرناک احتجاج کیا۔ ورنہ

نزہت اس دکھ سے قطعاً نجات پالیتی بجم بڑی خوش تھی۔ بی بی کے ہاں بچہ ہوگا وہ اس بچہ کو پالے گی، اسے دودھ پلایا کرے گی، اس کے کپڑے دھوئے گی اور نہ جانے کیا کیا کرے گی۔

وہ وقت بھی آن پہنچا جب نزہت، ہزاروں زلزلوں اور طوفانوں میں سے گزرنے کے بعد ماں بنی۔ اور ایک چاند سا ننھا اسکے پہلو کی زینت ہوا نزہت اس عالم میں نہ تھی کہ اس بچہ کی صورت دیکھتی، نہ اسے اس بچہ کے دیکھنے کا شوق ہی تھا۔ وہ تو درد اور تکلیف سے مری جارہی تھی اور لیڈی ڈاکٹر سے بڑی بے چارگی سے درخواست کررہی تھی۔

مجھے کوئی ایسی چیز کھلا دیجئے کہ میں مر جاؤں۔

لیڈی ڈاکٹر اصل حالات سے واقف نہ تھی۔ وہ مسکرائی۔ اسے روزانہ ایسی عورتوں سے واسطہ پڑتا جو اس گھڑی ایسی ہی درخواست کرتیں۔ مگر اگلے سال پھر بچے کی ماں بن جاتیں۔ اور ایسی تکلیف کا مشاہدہ پھر فرماتیں۔ لیڈی ڈاکٹر نے اس کی اس درخواست پر غور کئے بغیر نرسوں کو حکم دیا۔ بی بی کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھام لو۔ اور خود اپنا بقیہ فرض پورا کرنے میں لگ گئی۔

باہر بریگیڈیر صاحب۔ کانٹوں پر لوٹ رہے تھے۔ ان کے چہرے کی رنگت زرد پڑ چکی تھی۔ مگر ان کے کچھ بس میں نہ تھا۔ جب، تھوڑی دیر بعد لیڈی ڈاکٹر اپنا کام انجام دینے کے بعد باہر آئی۔ اور بریگیڈیر صاحب کو خوشخبری دی۔

بی بی خطرہ سے نکل گئی۔ اب کوئی فکر کی بات نہیں رہی۔

تو بریگیڈیر صاحب وہیں زمین پر سجدے میں گر پڑے۔ اور رو رو کر،

پروردگار کا شکر ادا کیا۔ لیڈی ڈاکٹر انگریز خاتون تھی۔ یہ تماشہ بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ بریگیڈیئر صاحب جب سجدہ سے اٹھے تو حیرت سے پوچھا۔

آپ اتنے بڑے افسر ہو کر، ایسی حرکت کرتے ذرا نہیں شرماتے۔

بریگیڈیئر صاحب کیا جواب دیتے کہ میرا بھی آج سے پہلے، ایسا ہی خیال تھا۔ میں بھی ایسی حرکات کرنے والوں سے یہی سوال کرنے کا عادی تھا۔ مگر اب میں... تمہیں کیسے بتاؤں مجھ میں کیا تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔

یہ تبدیلی جو بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں میں پیدا ہوئی تھی، اس کا تماشہ تو نجم، نزہت سلمیٰ روز دیکھتی۔

یہ بریگیڈیئر اتنے بڑے عہدیدار ہونے کے باوجود، اس ننھے بچے کی آیا گیری فرما رہے تھے۔ وہ دفتر سے آتے تو جب تک کئی گھنٹے، نزہت کے اس بچے کی خدمت نہ کر لیتے کسی اور کام میں دلچسپی نہ لیتے۔ یہ ننھا بچہ جو محض غلاظت کا ڈھیر تھا۔ بریگیڈیئر صاحب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ اور کبھی کبھی جب نجم سلمیٰ نزہت کے سامنے، بریگیڈیئر صاحب کی ان حرکات کا ذکر کرتیں تو نزہت کا دل آپ ہی آپ ڈولنے لگتا۔ اور وہ سوچنے لگتی ——————۔ اے کاش میں نے بریگیڈیئر صاحب سے بیاہ کیا ہوتا مگر اس کے سوچنے سے کیا ہوتا تھا، اس نے جس سے بیاہ کیا تھا، اس کے نمائندے، صبح و شام اس کوٹھی کا طواف کر رہے تھے۔ بڑی رانی صاحب ایک ہفتہ میں چار دفعہ آ چکی تھیں۔ اور کرنل صاحب تو کئی کئی گھنٹے یہیں گزارتے۔ ان لوگوں کا انداز کچھ ایسا تھا۔ کہ نزہت کو پھر شمیم پور لے جائیں۔

مگر ابھی وہ، اس کی علالت کے سبب .... یہ بات منہ سے نہ نکال رہے تھے۔ البتہ اس دن جب نزہت نے غسل صحت کیا۔

رانی صاحبہ، اپنی خواہش کو چھپا نہ سکیں اور سلمٰی، سورن، اور کتنی ہی اور مہمان عورتوں کی موجودگی میں نزہت سے کہا۔

دلہن، ہمارے خاندان کی بہت پرانی رسم ہے کہ جب ہماری دُلہنیں، ریاست کا وارث جننے کے بعد پہلا نہاتی ہیں تو ہم ماں بیٹے کو چاندی میں تولتے ہیں۔

سلمٰی نے بات پوری طرح نہ سمجھ کر جواب دیا۔

تو پھر نزہت کو تول لیجئے چاندی میں۔ چاندی تو آج کل کافی سستی ہے۔

رانی صاحبہ نے مسکراتے ہوئے اصل بات کہی

لیکن بیٹی یہ رسم، دُلھن کے میکے میں نہیں سسرال میں ادا ہوتی ہے۔

دُلھن کو اب، اپنے گھر چلنا ہوگا۔ وہیں یہ رسم ادا ہوگی۔

نزہت کو ایسے لگا جیسے اس بوڑھی عورت نے، اپنے دونوں بوڑھے ہاتھوں میں تیز چاقو پکڑ کر اس کے سینہ میں اُتار دئے ہیں۔ وہ کسی قیمت پر بھی، اس گھر میں جانے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ یہ گوارہ کر سکتی تھی کہ رانی صاحبہ، اپنے اس وارث کو یہاں سے لے کر چلتی بنیں۔ مگر وہ خود وہاں جائے جہاں انسان نہیں بھیڑیئے رہتے تھے قطعاً ناممکن تھا۔ اس نے رانی صاحبہ سے اپنا یہ فیصلہ کہہ دیا۔ رانی صاحبہ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا۔ شمیم پور کی یہ رانی صاحبہ۔ یہ کسی طرح سوچ نہ سکتی تھیں کہ ان کے بڑے بیٹے کی بیاہتا بیوی، ان کے وارث کی ماں، اس قسم کی گستاخانہ بات کہے۔

انہوں نے دھمکی دی۔

تمہیں وہاں جانا ہوگا۔ اور یہ بچہ ہمارے سپرد کرنا ہوگا۔

نزہت نے ان کی طرح غصہ میں کانپ کر، پاس کھڑی نجم سے بچہ کو اچک لیا اور ان کی گود میں ڈالتے ہوئے چیخی۔

آپ لے جایئے اپنے اس وارث کو یہاں سے لیکن خبردار جو اس دن کے بعد یہاں آئیں۔ یا آپ کے کسی آدمی نے یہاں قدم رکھا۔!

یہ آپ کی ریاست نہیں میرا گھر ہے اور میں اس گھر کی مالک ہوں۔

بات بہت بڑھ گئی تھی، نجم اور سلمیٰ، بات کو اس حد تک پھیلانے کیلئے آمادہ نہ تھیں، انہوں نے روتے بچہ کو رانی صاحبہ کی گود میں سے لے لیا۔ اور التجا کی۔

رانی صاحبہ ذرا صبر سے کام لیجئے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

رانی صاحبہ کو خود یہ معلوم نہ تھا نزہت یہ اقدام کرے گی۔ وہ بھی بوکھلا سی گئی تھیں۔ بجھے بجھے دل کے ساتھ نوازدلا لوٹ گئی تھیں کہ بھائی سے کوئی مشورہ کریں۔

وہاں کنور صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ ابھی ابھی باہر کے ٹیلگرام پر یہاں آئے تھے۔ ماں نے ساری بات ان سے کہہ دی۔ اور کنور صاحب تو غصہ کے مارے صوفے پر دو دو فٹ اوپر کو اچھلنے لگے۔ ان کے منہ سے جھاگ چھوٹ رہے تھے۔ اور وہ چیخ رہے تھے۔

میں اس مغرور کا سر کچل دوں گا۔ میں اسے گولی مار دوں گا۔

مگر یہ کرنیل صاحب خوب جانتے تھے۔ نزہت کا سر کچلنا آسان نہ تھا

نہ اسے گولی ماری جا سکتی تھی۔ اگر گولی ماری بھی جا سکتی تو کرنیل صاحب کبھی یہ اقدام نہ ہونے دیتے۔ وہ اس نزہت کو بچوں کی طرح پیار کرتے تھے کوئی ایسی حرکت گوارہ نہ کر سکتے تھے، جس سے نزہت پر آنچ آتی۔

انہوں نے کنور کو ٹھنڈا کیا اور رانی صاحبہ کو سمجھایا۔ حکمت عملی سے کام لیں۔ اور انہیں موقعہ دیں کہ وہ نزہت کو راہ پر لائیں۔

مگر جب انہوں نے اس سلسلہ میں نزہت سے بات کی۔ تو اس نے بچوں کی طرح روتے ہوئے، ان کے کوٹ کا دامن پکڑ کر ان سے التجا کی۔

ماموں جان خدا کے لیے مجھ سے ایسی خواہش نہ کیجئے جو میری موت کے مترادف ہے۔

یوں اگر آپ مجھے مارنا ہی چاہتے ہیں، تو میرا گلا حاضر ہے، آپ اپنے ہاتھ سے اسے کاٹ ڈالیے۔ اپنی بندوق میں گولی بھر لیجئے۔ اور میرے سینہ کی آزمائش کیجئے۔

کرنیل صاحب نے، اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کی پیشانی دیوانہ وار چوم لی۔ پھر انہوں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ اور کنور اور رانی صاحبہ سے جا کر کہہ دیا۔ وہ چپکے سے شمیم پور لوٹ جائیں۔ اور کسی قسم کی جدوجہد نہ کریں مگر نہ رانی صاحبہ ماننے والی تھیں اور نہ کنور صاحب لوٹنے کے لیے آئے تھے۔

انہوں نے کرنیل صاحب کے ہاں سے رخصت ہو کر، دہلی کے ایک بڑے ہوٹل میں ڈیرے جمائے اور دوسرے ہی دن نزہت بیگم پر مقدمہ داغ دیا۔

یہ مقدمہ یوں تو بڑا ہی تشویش ناک تھا۔ مگر بریگیڈیئر آفتاب احمد خاں کی

محنت اور اثر ورسوخ نے اسے زیادہ تکلیف دہ نہ ہونے دیا۔ اور عدالت نے طرفین کی پوزیشن کا احترام کرتے ہوئے فیصلہ دیا کہ جب تک بچہ چار سال کا نہ ہو جائے۔ نزہت بیگم بچہ کو اپنے پاس رکھ سکتی ہیں۔ اس کے بعد بچہ، باپ کے سپرد کر دیا جائے۔

کنور صاحب نے اس فیصلہ کے خلاف اپیل کیا۔ مگر اس اپیل کا فائدہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوا کہ نزہت بیگم کے پاس بچہ رہنے کی عمر چار سے کم ہو کر تین سال کی ہو گئی۔

اس مقدمہ کے دوران میں بریگیڈیئر، آفتاب احمد خاں اور نزہت ایک دوسرے کے قریب کچھ اس طرح آئے جیسے کبھی آئے نہ تھے۔ بریگیڈیئر صاحب تو خیر نزہت کے جان نثار عاشق تھے۔ مگر نزہت بھی کچھ اس طرح محسوس کرنے لگی تھی کہ بریگیڈیئر صاحب کے سوا اب کوئی مرد ایسا نہیں جو اسکے دل میں جگہ پا سکے منو کو وہ اب تک نہ بھولی تھی، لیکن یہ بات تو مقدمہ کے دوران میں لوگوں کو معلوم ہوئی کہ منو سے اس کی محبت وہ محبت نہ تھی جو ایک عورت کو مرد سے ہوتی ہے یہ محبت ویسی ہی تھی جیسے دو مرد دوست ایک دوسرے سے رکھتے ہیں یا جیسے دو عورتیں ایک دوسری کو چاہتی ہیں۔ اور اس نے منو کے بھائی سے جو شادی کی تھی۔ اس میں یہی جذبہ کام کر رہا تھا کہ وہ اپنے اس دوست کے خاندان میں پہنچ جائے جو اس کی خاطر جلا وطن ہوا اور اس کی جائداد اور پنشن اسے واپس مل جائے۔

منو اب تک جب اسے یاد آتا۔ تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں۔

مجیب بریگیڈیئر آفتاب احمد خان آنسوؤں سے بھری ہوئی ان آنکھوں پہ اپنے ہاتھ رکھ دیتے تو نزہت کا دل ایک ایسے لرزے کو محسوس کرنے لگتا جیسا زلزلہ کبھی کسی مرد کے لمس سے اسے محسوس نہ ہوا تھا۔ وہ انکے یہ ہاتھ اپنی آنکھوں سے ہٹا کر اپنے دل پہ رکھ لیتی اور بریگیڈیئر صاحب کا دل شمع کی طرح بھڑکنے لگتا۔

بارہواں باب

مگر منو سے جو پیار کرتی تھی۔ وہ اب تک اپنی روش پر قائم تھی۔ اس کی کسی بات میں بھی کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ وہ روزانہ صبح اٹھ کر، منو کے نام ایک طویل خط ٹائپ کرتی۔ اس خط کو آپ لفافے میں بند کرتی اور صاحب۔ دادخان سے کہتی صاحب دادخاں اسے اوورسیز جانے والی ڈاک میں ڈال آؤ۔

صاحب دادخان بڑے ادب سے جھک کر یہ بھاری لفافہ لے لیتا اور تیز تیز قدم اٹھاتا۔ ڈاک خانہ کے پاس آتا۔ وہاں بریگیڈیئر لقمان، زرد رزد رنگت، اور کھوئی کھوئی آنکھوں کے ساتھ، روزانہ اس کا انتظار کرتے۔ صاحب دادخاں ان سے آنکھیں دوچار کئے بغیر یہ خط ان کے ہاتھ میں دیتا وہ یہ خط اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیتے۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے۔ چھاونی میں آجاتے۔ انہوں نے ریکروٹنگ کے شعبہ سے توبہ کر لی تھی۔ اور اس بریگیڈیئر کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ جو روس کے منع حملہ کی روک تھام کے لئے، ہزارہ کے علاقہ میں متعین تھی۔

انہوں نے تو اپنی طرف سے، جنرل ہیڈ کوارٹر کو اپنا استعفیٰ بھیج دیا تھا۔ اور

کچھ ایسے وجوہ بیان کئے تھے، کہ جنرل ہیڈ کوارٹر نے، ان کی خدمات، اس طرف منتقل کردیں۔ اور انہیں لکھا۔ آپ ایسا آدمی، ہم اپنے ہاتھ سے دینا گوارہ نہیں کرسکتے۔

وہ اس علاقہ کی بریگیڈ کے سب سے بڑے افسر تھے۔ انہیں پورے اختیارات حاصل تھے۔ مگر یہ ان کا جی ہی جانتا تھا کہ جب وہ ہر صبح صاحب داد خاں کے ہاتھ سے یہ لمبا سا ٹائپ شدہ لفافہ لے کر اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالتے۔ تو انہیں اپنی بے بسی، اپنی بے چارگی اور اپنی مجبوری کس درجہ محسوس ہوتی۔ انکی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں اور دل ہزار ہزار زلزلے، اپنے اوپر مسلط پاتا۔

انسان کے صبر کی حد ہوتی ہے۔ مگر ان کے ضبط کی تو کوئی حد نہ تھی۔ البتہ اس صبح۔ جب باہر زور کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی جھکڑ چل رہے تھے۔ ایک عجیب حادثہ پیش آیا۔ وہ حسب دستور، بارش میں بھیگتے لیٹر بکس کے قریب آن کھڑے ہوئے ابھی انہیں یہاں آئے دو منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک اور، وجود، ہوا اور بارش کا مقابلہ کرتا اس لیٹر بکس کے قریب پہنچا۔ یہ صاحب داد خاں نہ تھا۔ یہ زہرہ بیگم تھی اور راحت کسی برانڈی، یا کسی وزنی کمبل چادر کے بغیر، عشق کی آگ میں جلتی، یہاں پہنچی تھی۔ لیٹر بکس کے قریب پہنچ کر جیسے ہی اس نے لیٹر بکس میں خط پھینکا۔ آپ ہوا کے ایک تیز تھپیڑے سے لڑ ۔ تی توازن کھو گئی۔ اور دھڑام سے زمین پر گر گئی۔

یہ ضبط اور صبر کا بڑا خوفناک امتحان تھا۔ ضبط کہتا خبردار جو آگے بڑھے مگر عشق کہتا۔ اگر یہ وجود ہی باقی نہ رہا جس کے لئے تم جی رہے ہو تو پھر اس ضبط سے کیا حاصل، عشق نے ضبط پر غلبہ پا لیا اور انہوں نے تیزی سے

آگے بڑھ کر بھیگی ہوئی زمرد بیگم کو زمین پر سے اُٹھایا۔ گود میں بھرا اور دیوانوں کی طرح بھاگتے اپنی موٹر کی طرف آئے۔ اسے موٹر میں ڈالا، اور اس کے احتجاج کے باوجود، موٹر کو تیز تیز دوڑانے لگے وہ ان کی پشت پر آن کھڑی ہوئی۔ اور انکو اشارہ

یہ آپ، مجھے کیوں اُٹھالائے۔ یہ آپ نے اپنا عہد کیوں توڑا۔

بریگیڈیئر صاحب، کے کانوں سے یہ ڈانٹ، بجلی کے کرنٹ کی طرح ٹکرا رہی تھی۔ اور ان کا دل ان جھٹکوں کو پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ مگر متواتر ایک سال کے ہولناک فراق، اور اس روز روز کے کرب بخش انتظار نے، آج ایک نئے اضطراب کی صورت اختیار کر لی تھی۔ آج انہوں نے زمرد کے بھیگے ہوئے جسم کو اپنی گود میں بھر کر جو لذت پائی تھی، اس نے، ان کے آہنی عزم اور مضبوط کردار کی بہت سی گرہیں ڈھیلی کر دی تھیں۔ اور وہ زمرد کے احتجاج، کے باوجود، موٹر کو تیز تیز دوڑائے جا رہے تھے۔ نہ انہیں زمرد کے احتجاج کی پروا تھی اور نہ ہوا کے تند و تیز تھپیڑا اور بارش کی شدت ہی سے متاثر تھے۔

ایبٹ آباد کی حدود ختم ہو گئے تھے۔ اور وہ تنگ سڑک شروع ہو گئی تھی جو وادی کاغان کو جاتی ہے۔

ان کی موٹر، کئی میل دور آ چکی تھی۔ سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک اوپر، اوپر چڑھتی جا رہی تھی، اور زمرد موٹر کی پشت کے ساتھ لگ کر، بچوں کی طرح سسکیاں بھرنے لگی۔ یہ سسکیاں اس عورت کی سسکیاں تھیں۔ جسے بریگیڈیئر صاحب، دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز جانتے تھے۔ انہوں نے، دفعتاً موٹر روک لی۔ اور پیچھے کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

کیا تمہیں میری ذات پر اعتماد نہیں رہا۔ کیا تم اس لقمان کو اتنا حقیر سمجھنے لگی ہو جس نے متواتر چھ مہینے تمہارے ساتھ اس طرح گزارے جس طرح کوئی مرد گزار سکتا۔ کیا تمہارا خیال ہے۔ پہاڑوں کی اس بلندی بارش کے اس طوفان اور اس چاروں طرف پھیلی خوفناک تنہائی میں تمہاری عزت میرے ہاتھوں محفوظ نہیں ہے۔

زمرد کی سسکیاں رک گئیں۔ اس نے آنسو بہاتی آنکھیں بریگیڈئیر صاحب پر اٹھا دیں۔ اس چہرہ پر ایک عجیب جلال اور ایک انوکھی رعنائی تھی، ایسی رعنائی اور ایسا جلال، تو شائد فرشتوں کو بھی میسر نہ تھا۔ اور اس نے بات بنائی۔

میں، اپنے لیے نہیں ڈر رہی تھی۔ مجھے وہم تھا، کہیں آپ ہوش و حواس کھو نہ بیٹھیں۔ اور خدا نخواستہ ہمارا موٹر۔

وہ تلخی سے مسکرا پڑے۔ اور منہ سامنے کی طرف کر کے، اپنے دونوں ہاتھ ہینڈل پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

اور تم شاید ہمارے ساتھ مرنے سے بھی نفرت کرتی ہو۔

موٹر پھر آگے کو بھاگ نکلی، زمرد نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ اور سیٹ پر کسی قدر آگے کو جھک کر، روتے ہوئے کہنے لگی۔

اے کاش میں پیدا نہ ہوئی ہوتی۔ یا اگر پیدا ہوئی تھی۔ تو منو میری زندگی میں نہ آئے ہوتے۔

اس کی آواز ... دھیمی ہو گئی۔

میں کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ اگر منو میری زندگی میں نہ آتے اور صرف آپ آتے تو۔

بریگیڈئیر صاحب نے ایک بار پھر موٹر روک لی۔ اور پیچھے کی طرف منہ موڑ کر پوچھا۔

اور اگر منّو نہ آیا ہوتا، اور صرف میں آیا ہوتا۔ تو خدا کی قسم میں۔ تمہیں کبھی اس طرح پیار نہ کرتا جس طرح اب کرتا ہوں۔

تم شائد نہیں جانتیں، میری محبّت، دوسرے لوگوں کی محبّت سے قطعاً مختلف ہے۔ میں نے تم سے صرف اس لئے محبّت کی کہ تم منّو سے محبّت کرتی تھیں،

زمرد نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر بریگیڈیئر صاحب، نے مُنہ آگے کی طرف کر دیا۔ اور موٹر کو پھر پہلے کی طرح دوڑانے لگے ان کے اندر ایک خوفناک ہیجان بھر گیا تھا ایسا ہیجان جس سے وہ اس وقت سے پہلے کبھی آشنا نہ ہوئے تھے۔

خود زمرد کے دل میں ایک عجیب کشمکش ہو رہی تھی ——— وہ سوچ رہی تھی اے کاش وہ یہاں نہ آئی ہوتی۔ اور اس کی زندگی میں یہ ہولناک جبر نہ پیدا ہُوا ہوتا دل کے ہیجان سے گبھرا کر، اس نے اپنا منہ شیشہ کے ساتھ لگا کر، باہر کی طرف دیکھا موٹر اس لمحہ جس موڑ پر مڑ رہی تھی۔ وہ نہ صرف تنگ ہی تھا۔ بلکہ، آہستہ آہستہ بلند ہوتا جا رہا تھا اور موٹر، تند و تیز ہوا کے تھپیڑے کھاتی اس طرح اوپر چڑھ رہی تھی۔ جیسے وہ دور اوپر پہاڑ کی چوٹی سے چھُو کر، لا محدود فضا میں اُڑنے لگے گی۔

زمرد کا دل ایک بار پھر بُری طرح کانپ اُٹھا، اور اس نے سوچا۔

اگر بریگیڈیئر صاحب کے ہاتھ ذرا بھی کانپ جائیں، تو ہم نہ جانے کتنے ہزار فٹ گہرے کھڈ میں جا گریں۔

اور پھر ———

اور اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہ سکی، نہ جانے کیوں، اس کے دل میں آرزو پیدا ہوئی۔

یہ موٹر کھڈ میں نہ گرے اور یہ لقمان۔ موت کے اژدہے کا شکار نہ بنیں۔
اور ابھی وہ یہ چاہ رہی تھی کہ موٹر، آٹھ ہزار فٹ کی بلند چوٹی پہ پہنچ کر، پھر نیچے کو لڑھکنے لگی۔ بریگیڈئر صاحب بڑے اچھے ڈرائیور تھے ورنہ، اس تیز ہوا، اور بارش میں، موٹر کو متوازن رکھنا، کوئی آسان کام نہ تھا۔ پہلے چڑھائی تھی اب موٹر نیچے کو اتر رہی تھی۔

بریگیڈئر صاحب نے ایک بار پھر موٹر کو روکا۔ اور پیچھے کی طرف جھک کر، اچانک زمرد سے پوچھا۔

زمرد اگر منو، اچانک، یہاں آجائیں، اور ہم دونوں کو اس عالم میں، یوں تنہا دیکھیں تو . . . .

زمرد . . . . . . بے اختیار رونے لگی اور روتے روتے جواب دیا۔

مگر یہ کیسے ممکن ہے۔

بریگیڈئر صاحب نے بلا سوچے سمجھے جواب دیا۔

اس دنیا میں ہر بات ممکن ہے۔

زمرد نے انتہائی بے صبری سے پوچھا۔

کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہیں۔

بریگیڈئر کے اندر بیٹھے مرد نے ان کے دل کے کان میں کہا۔ کہہ دو، مجھے تو قطعاً یقین نہیں ہے۔

مگر بریگیڈئر لقمان ایسی بات، جو سولہ آنے صحیح نہ تھی، کہہ نہ سکتے تھے۔ انہوں نے اس کی روتی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

نہ مجھے ان کی موت کا یقین ہے اور زندہ ہونے کا۔ دونوں باتیں یکساں غیر یقینی ہیں۔ پچھلی جنگ میں، بعض ایسے لوگ، پھر اپنے عزیزوں میں آن پہنچے، جن کے گم ہونے یا بم باری میں تباہ ہونے کی خبر دی گئی تھی۔

جنگ میں جن لوگوں کی نعشیں نہیں ملتیں، جو لاپتہ بتائے جاتے ہیں، نہ ان کی موت یقینی ہوتی ہے اور نہ زندگی۔

زمرد کا جی چاہا، اپنا سر، اس شخص کے پاؤں پر رکھ دے۔ جو اپنے رقیب کی زندگی کے امکان پر اس قدر صاف بیانی سے کام لے رہا تھا۔ نہ جانے کیوں زمرد کی روتی آنکھیں خشک ہوگئیں۔ اور اس نے۔ باہر کی طرف دیکھکر بریگیڈیر صاحب سے کہا۔

اگر ہم دونوں، باہر نکل کر، تھوڑی دیر گھومیں، اس بلندی پر اُگے ہوئے چیل کے درختوں اور پھولوں سے گفتگو کریں تو کیا۔

بریگیڈیر صاحب نے بات کاٹ لی۔

تو کیا تمہارا مطلب ہے، ہمارے پاؤں ڈگمگائیں گے نہیں!

زمرد شرما گئی۔

اور بریگیڈیر صاحب نے، موٹر کا پٹ کھولا، باہر نکلے، آگے کو جھک کر دوسرا دروازہ کھولا۔ اور زمرد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر باہر کو کھینچا۔ زمرد کو ایسے لگا۔ جیسے اس کے جسم سے بجلی چھو گئی تھی۔

باہر فضا، بڑی ٹھنڈی تھی۔ اور زمرد کے کپڑے، گیلے تھے۔ جب تک وہ موٹر میں بیٹھی تھی۔ اسے اپنے گیلے ہونے کا احساس نہ ہوا تھا، مگر اب تو اس کا جسم بہت بُری طرح کانپنے لگا تھا اور اس نے بریگیڈیر صاحب سے التجا کی۔

باہر تو بڑی ٹھنڈک ہے اور میرے کپڑے گیلے ہیں۔
بریگیڈیئر صاحب نے اس پورے وقفہ میں پہلی بار اس کے جسم پر نگاہ کی۔ اس قدرِ رعنا، کو جو لباس اپنے اندر چھپائے تھے وہ جسم سے چپک گیا تھا۔ اور بریگیڈیئر صاحب کو ایسے لگا۔ جیسے ان کا ذہن اپنا توازن کھو جانے کو ہے۔ وہ جلدی سے، موٹر کی طرف لپکے، اور موٹر کے اندر گھس کر جلدی جلدی اپنے جسم پر پہنی ہوئی برانڈی اُتاری، پھر، کوٹ، اُتارا، پھر سویٹر، اور یہ دونوں چیزیں پچھلی سیٹ پر پھینک دیں برانڈی پھر پہن لی، باہر آئے۔ اور زمرد کو حکم دیا۔
موٹر کے اندر جاکر، اپنے کپڑے بدل ڈالو۔ ورنہ بیمار پڑ جاؤگی یہ تم نے ہمیں پہلے کیوں نہ کہا۔ کہ تمہارے کپڑے بھیگ گئے ہیں، اگر تمہیں کچھ ہو گیا، تو جانتی ہو۔ . ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
میرا کیا انجام ہو گا۔
وہ بچوں کی طرح رونے لگے، اور زمرد سوچنے لگی۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا، تو کیا یہ زندہ نہیں رہیں گے، کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اس سے آگے، اس کے ذہن کو بہت زور کا جھٹکا لگا۔ اور بریگیڈیئر صاحب نے انتہائی بے صبری اور بے چینی کے ساتھ اس سے التجا کی۔
خدا کے لئے جلد جلد کپڑے بدل ڈالو۔
اور وہ خود، چیل کے ایک لمبے لمبے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر، دور، کہر اور بادلوں سے ڈھکی ہوئی فضا کو دیکھنے لگے۔
زمرد نے موٹر کی کھڑکی کے سامنے، اپنی گیلی اوڑھنی ڈال کر پہلے شلوکا اُتارا، پھر قمیض اور پھر بنیان، اس کا جسم کانپ رہا تھا اور ہاتھ برف ہو رہے تھے۔ نہ جانے

کیوں جب وہ بریگیڈیئر صاحب کا ڈھیلا ڈھالا سویٹر پہن رہی تھی، اسکے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگی تھیں اور اسکا جی چاہ رہا تھا یہ سویٹر نہ پہنے۔ مگر اس نے یہ سویٹر پہن لیا۔ نہ صرف یہ سویٹر پہنا بلکہ کوٹ کی جیبیں کسی قدر بھاری تھیں، اس کے ہاتھ آپ ہی آپ ان بھاری جیبوں کو ٹٹولنے لگا۔ ایک جیب سے جب اس کے ہاتھ باہر نکلا، تو اس میں تو وہی لفافہ رکھا تھا جسے اس نے کل کی ڈاک سے منّو کے نام بھیجا تھا۔

وہ شعلہ جو الہ کی صورت اختیار کر گئی، اس نے کوٹ کے بٹن تک بند نہیں کئے۔ اور دروازہ کھول کر نہیں قریب قریب توڑ کر باہر کو لپکی، بارش گو رُک گئی تھی مگر ہوا پہلے ہی کی طرح تیز تھی۔ وہ جس وقت بھاگتی ہوئی بریگیڈیئر صاحب کے قریب پہنچ تو وہ ابھی تک دور فضا میں دیکھ رہے تھے۔ اس نے اچانک انکو بازو سے پکڑ کر بہت زور سے جھنجھوڑا تو وہ کانپ گئے۔ اسکی طرف دیکھا۔ اس کے سنہرے بال پریشان تھے۔ اور کوٹ کے کھلے کالروں میں سے اس کی خوبصورت صراحی دار گردن یوں چمک رہی تھی جیسے سبزے سے ڈھکی ہوئی اونچی پہاڑی پر برف کی سفید لکیر چمکتی ہے۔

ان کا ذہنی توازن، بگڑتے ہی کو تھا کہ دیوانی زمرد نے لفافہ انکے سامنے کر کے ان سے جواب طلب کیا۔

یہ خط آپ کے پاس کہاں سے آیا۔

اور بارود کی آگ سے کھیلنے والے لقمان نے پورے ضبط کے ساتھ جواب دیا جہاں سے یہ خط، دو اپریل ۱۹۴۲ء سے لیکر تین مئی ۱۹۴۳ء تک آتے رہے۔

زمرد کا غصہ حیرت میں بدل گیا۔

یعنی تو کیا میرا ہر خط، اودر سینر جانے کی بجائے آپ تک پہنچ جاتا ہے۔

بریگیڈیر صاحب تلخی سے مسکرائے۔

جی ہاں۔ شائد آپ کو یہ سوال کرتے وقت یہ حقیقت یاد نہیں رہی کہ ہمارے اس فوجی ایریئے سے کوئی خط، ہمارے سنسر کے بغیر، باہر نہیں جا سکتا۔

زمرد نے اعتراض کیا۔

مگر، میرے خط، تو محض . . . . . .

بریگیڈیر صاحب نے جلدی سے بات پوری کر دی۔

رومان سے بھرے ہوتے ہیں، ان میں کوئی سیکریٹ نہیں ہوتا۔

وہ مسکرائے۔

یہ رومان، بھی، تو ایک بڑا سیکریٹ ہے۔

زمرد نے احتجاج کیا۔

مگر اس سے فوج کا تو کوئی تعلق نہیں۔

بریگیڈیر صاحب نے منہ دوسری طرف پھیر کر جواب دیا۔

یہ بات تو ہمارے طے کرنے کی ہے۔ یہ تو ہم فیصلہ کر سکتے ہیں۔

زمرد نے انداز بدلا، اور کسی قدر کپکپاتی آواز میں پوچھا،

پھر، یہ خط آپ کے سوا اور لوگوں نے بھی پڑھے ہوں گے۔

وہ مسکرائے۔ منہ اُدھر کر کے جواب دیا۔

انہیں نہ میں نے پڑھا، نہ کسی اور نے، ان کے متعلق، پوسٹ ماسٹر کو میری ہدایات ہیں، یہ خط کھولے بغیر، ہمارے پاس پہنچا دیے جائیں۔

زمرد کا جی چاہا۔ اپنا سر ان کے سامنے جھکا دے۔ جو رقابت میں بھی اصول

کے اس حد تک پابند تھے

بہر حال وہ عورت تھی، ایک بے وقوف عورت، اس کا خوبصورت سر ایک بار پھر ان کے سامنے جھک گیا، جو پھر دور فضا میں دیکھنے لگے تھے، جن کا صرف ایک رُخ، اس کی سمت تھا اور دوسرا رُخ اس سے پوشیدہ۔ لانبی فوجی برانڈی میں جس پر سرخ امتیازی نشانوں کے ساتھ ساتھ ان کی بریگیڈیئری کی علامات بھی چھپاں تھیں وہ کوئی بہت اونچے اور بہت بڑے آدمی نظر آرہے تھے۔ ایسے آدمی جو صرف خوابوں میں نظر آتے ہیں انہوں نے دفعتاً منہ پھیرا۔ اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر، اسے چیل کے درختوں کے ایک خوبصورت جھنڈ کی طرف لے چلے۔ چیل کے درختوں کا یہ جھنڈ۔ کہر میں ڈھکا، ایک عجیب، منظر پیش کر رہا تھا، ایسا منظر، جس کی حرارت سے آدمیت کا بت پگھل کر، پہاڑی ندیوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور وہ ان کے ڈھیلے ڈھالے کوٹ اور سویٹر میں لپٹی۔ انکے ساتھ ساتھ چل رہی تھی، اس کے جسم پر گو کوئی لرزا نہ تھا۔ مگر دل بہت تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کے پاؤں، اُٹھ نہیں رہے تھے اُٹھائے جا رہے تھے۔

چیل کے درختوں کے اس جھنڈ کے قریب پہنچ کر انہوں نے، ایک حسین پگڈنڈی اختیار کر لی، اور پھر اسے قریب قریب کھینچتے۔ ایک چھوٹے سے آبشار کے قریب لے گئے جہاں پانی کے تیز بہاؤ سے ایک چھوٹی سی پن چکی چل رہی تھی اور اس سے تھوڑے فاصلے پر، کئی چھوٹے چھوٹے ہٹ بنے تھے۔

پن چکی کے آس پاس، جو لوگ کھڑے تھے۔ انھوں نے ان دونوں کو دیکھا اور سلام بجا لائے۔ بریگیڈیئر صاحب انہیں دیکھ کر مسکرائے۔ حکم دیا۔

میم صاحب بھیگ گیا ہے۔ ہم نے اپنا کپڑا، ان کو پہنایا ہے۔ ذرا تم آگ جلاؤ۔ ہمارے لئے چائے بھی بنواؤ۔ اور کچھ کھانے کو بھی تیار کرو۔

پن چکی کا مالک شائد کسی فوج میں سپاہی رہ چکا تھا۔ اس نے بریگیڈیئر صاحب کے کندھوں کی طرف دیکھا۔ اور ان کی فوجی علامات دیکھ کر انہیں دونوں پاؤں بجا کر سلام کیا اور اپنے چھوٹے سے ہٹ کی طرف لپکا،

وہ دونوں بھی اس کے پیچھے پیچھے لپکے۔ یہ ہٹ گو دو چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا۔ لیکن اچھا خاصا صاف ستھرا تھا۔ اور اس کے صحن میں پن چکی کے مالک کی جوان بیوی اور دو بچے، کھڑے بڑے ہی بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ بچوں اور ماں نے ایک ساتھ سلام کے لئے ہاتھ اٹھائے، ریٹائرڈ سپاہی نے، پشتو میں اپنی بیوی سے کچھ کہا۔ بیوی اندر کو لپکی۔ زمرد کا جی نہ جانے کیوں ایک عجیب بات کے لئے تڑپا، اے کاش، منو سمندر پار نہ جاتا۔ اور وہ اس کے ساتھ اسی طرح کے کسی پہاڑ کے ایسے ہی سر سبز حصے میں ایسا ہی ہٹ بنا کر زندگی گزارتے ان کے ہاں بھی اسی طرح بچے ہوتے۔ اور وہ بھی ..... اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہ پائی تھی کہ بریگیڈیئر صاحب نے اچانک اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر، اسکی توجہ سامنے کی طرف کر دی، سامنے۔ ایک چھوٹی سی ندی پتھروں سے سر پھوڑتی نیچے کو گر رہی تھی زمرد نے اس طرف دیکھا۔ نہ جانے کیوں، اس کا احساس پہلے سے زیادہ خوفناک صورت اختیار کر گیا، اس نے اپنا ایک ہاتھ بریگیڈیئر صاحب کے گریبان میں ڈال دیا اور انتہائی تلخی کے ساتھ کہنے لگی۔

اگر آپ منو کو سمندر پار نہ بھیجتے۔ تو کیا۔ ہمیں، اس قسم کا کوئی پہاڑ اپنے

دامن میں پناہ نہ دے سکتا۔

بریگیڈیئر صاحب لرزنے کو تھے مگر انھوں نے خود پر قابو پا کر جواب دیا۔

کیوں نہیں۔ ان پہاڑوں میں تو اتنی وسعت ہے کہ ایک نہیں سیکڑوں بھگوڑوں کو، پناہ دے سکتے ہیں۔

وہ ذرا رُکے، زمرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ اور پہلے سے بدلی ہوئی آواز میں کہا مگر، قدرت کا منشا کچھ اور تھا، قدرت، تمہاری زندگی میں عمومیت پیدا کرنے کی بجائے، اسے ایک خصوصیت عطا کرنا چاہتی تھی۔

سونا، کٹھالی میں پڑ کر ہی کندن بنتا ہے۔ اور یہ تم کٹھالی میں پڑے بغیر، کس طرح کندن بنیں۔

زمرد نے، ایک بار پھر، انتہائی تعجب کے ساتھ انہیں دیکھا۔ اور سوچنے لگی، کیا یہ شخص، اپنے اونچے فلسفے، اپنے کھرے کردار کے سبب، میرا ہر شکوہ میرا ہر احتجاج، بے اثر بناتا رہے گا، کیا۔ میں کبھی، اسے گرتا ہوا نہ دیکھ سکوں گی، کیا کبھی، میں اسے اسی گراوٹ پر اسے شرمندہ کرنے کا حق نہ پاؤں گی۔

پن چکی کے مالک نے ان کے قریب آن کر ایک سیلوٹ مارا۔ اور اطلاع دی۔ کمرے میں آگ جلا دی گئی ہے۔

بریگیڈیئر صاحب نے زمرد کو حکم دیا۔

اندر جا کر، ذرا آگ سینک لو۔

زمرد کو اندر بھیج کر، وہ پھر، اس پگڈنڈی پر چلے، جس کے ذریعہ وہ اوپر سے نیچے کو اُترے تھے۔ پن چکی کا مالک، میم صاحب کو اندر چھوڑ کر باہر آیا اور اُن کو

اوپر کی طرف جاتے دیکھا۔ تو وہ بھی ان کے پیچھے چلا۔

مگر وہ کافی فاصلے پر جا چکے تھے اور اس ریٹائرڈ سپاہی کو اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ اتنے بڑے افسر کو پیچھے سے پکارتا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے اوپر کو چڑھتا رہا۔

وہ پھر بڑی سڑک پر آ گئے تھے اور سامنے ان کی موٹر وہیں کھڑی تھی جہاں وہ اسے چھوڑ گئے تھے۔ اس موٹر کے قریب پہنچ کر وہ رکے، پیچھے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھولا۔ برانڈی کی جیب میں سے کنجی نکال کر موٹر کا ایک خانہ کھولا۔ ریوالور باہر نکالا، اس میں سے گولیاں بھریں۔ پیٹی گلے میں لٹکائی، ریوالور ہاتھ میں پکڑا۔ زمرد کے گیلے کپڑے موٹر میں سے اٹھا کر کندھے پر ڈالے، اور پھر پیچھے کو لپکے۔ پن چکی کا مالک یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا تھا اس طرح جیسے اپنے گھر والوں کو کسی بڑے خطرے سے آگاہ کرنے جا رہا ہو۔ اور ان کا انتظار کئے بغیر ایک دوسری پگڈنڈی سے جو پہلی پگڈنڈی سے کم فاصلے پر مشتمل تھی نیچے کو لڑھکا وہ بڑی تیزی سے بھاگ رہا تھا وہ بریگیڈیئر صاحب سے کتنی دیر پہلے، اپنے ہٹ میں پہنچ گیا۔ اور زمرد کو ٹوٹی اردو میں صاحب کی حالت سے آگاہ کیا۔ زمرد یہ آگ سینک کر، کچھ زیادہ بیدار ہو گئی تھی، آگ نے اس کے زرد زرد گالوں کو کسی قدر گرما دیا تھا۔ اور وہ صاحب کے ڈھیلے ڈھالے کوٹ کو، اپنے چاروں طرف لپیٹے ایسے ہر خطرہ سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھی۔

اسے ڈر کس بات کا تھا۔ اس کی زندگی کس کام کی تھی۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات تھی اگر صاحب، اسکی اس زندگی کو اپنے ریوالور کی مدد سے ختم کر دیتے۔

تو جب صاحب آ گئے، تو ریوالور ان کے ہاتھ میں نہیں انکی جیب میں تھا البتہ پیٹی باہر لٹک رہی تھی۔ انہوں نے۔ دیوار میں بنی انگیٹھی میں جلنے والی۔

تیز آگ کی روشنی میں، سرخ انگاروں کی صورت اختیار کئے زمرد کے چہرے پر نگاہ کی۔ اور کچھ عجیب طرح مسکرائے۔ پن چکّی کے مالک سے جو ذرا فاصلے پر کھڑا کسی قدر کانپ رہا تھا۔ فرش پر بیٹھنے کی اجازت چاہی۔

فرش پر، دیسی ساخت کا ایک چھوٹا سا قالین بچھا تھا۔ جس کے دونوں کنارے پر پھونس کی تہ، ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک پھیلی تھی۔

پن چکّی کا مالک اب کچھ سنبھل گیا تھا اور پہلے جیسی خطرناک بات کی بجائے۔ اب یہ سوچ رہا تھا۔ صاحب نے۔ ریوالور میں گولیاں اس لئے نہیں بھریں کہ میم صاحب کو ماریں بلکہ احتیاطاً اور حفاظت کے طور پر یہ کام کیا ہے۔

اس نے ایک دفعہ پھر انہیں سلامی دی۔ اور وہ مسکرا کر زمرد کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ اور اس کی شمیز، قمیص اور اوڑھنی کو اپنے گھٹنوں پر پھیلا کر آگ کی حرارت سے سکھانے لگے۔

زمرد اور ان میں کبھی کبھی آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہو جاتیں۔ مگر زبان اب تک دونوں کی بند تھی۔

پہلے شمیز خشک ہوئی، اور پھر قمیص اوڑھنی۔ یہ تینوں چیزیں بریگیڈیئر صاحب نے زمرد کی طرف پھینک دیں اور حکم دیا۔

ہمارا سویٹر، اور ہمارا کوٹ ہمیں واپس کردو، اور یہ اپنی چیزیں آپ پہن لو، ہمارے اس لباس میں تم ہمیں کچھ زیادہ اچھی نہیں لگیں۔

زمرد کا جی چاہا۔ کہے۔
لیکن مجھے اسکی کب کوئی خواہش ہے کہ میں آپ کو اچھی لگوں۔

یہ تو آپ، خود ہی۔ . . . . . .

اس سے آگے اس نے ابھی کچھ اور نہ سوچا تھا کہ بریگیڈیئر صاحب نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے۔ اس کے سراپے پر نظر ڈالی، اور پن چکی کے مالک سے کہا۔

بھئی ذرا ہم تم باہر ہو جائیں۔

میم صاحب، اپنے کپڑے پہن لیں۔

دونوں باہر پہنچے، تو باہر، پن چکی کے مالک کا چھوٹا بھائی، ایک بڑے سے مرغ کی گردن پر چھری چلا رہا تھا۔ بریگیڈیئر صاحب اسے دیکھ کر مسکرائے، برانڈی کی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالا، اور دس دس روپے کے دو نوٹ نکال کر، پن چکی کے مالک کو دیتے ہوئے کہنے لگے۔

معاف کرنا بھئی۔ ہم تمہارے اوپر بوجھ بننا نہیں چاہتے۔

پن چکی کا مالک، گو کوئی رئیس نہ تھا۔ مگر، خود دار پہاڑی پٹھان تھا۔ اس نے نوٹ، لوٹا دئے اور صاحب سے کہنے لگا۔

صاحب ——— میں ایک سال ہوا، فوج سے زخمی ہو کر ڈسچارج ہوا ہوں، میری پیٹھ پر، ایک بڑا زخم آیا تھا۔ اس کے سبب میں۔ رائفل اُٹھانے کے قابل نہیں سمجھا گیا۔

ورنہ صاحب . . . . میں۔

بریگیڈیئر صاحب نے بات کاٹ لی۔

تم صوبیدار ہو کر واپس آتے۔ یا ابھی نہ آئے ہوتے۔ وہیں بہادری کے کارنامے بنا رہے ہوتے۔ تم اگر چاہو۔ تو ہم تمہیں اب بھی صوبیدار بنا سکتا ہے۔

ریٹائرڈ سپاہی نے پہلے سے زیادہ ادب کے ساتھ سیلوٹ دیا۔ اس کے الفاظ کانپنے۔

مگر صاحب ....

بریگیڈیئر صاحب نے اسے بات پوری نہ کرنے دی۔

تم ہتھیار نہیں اُٹھا سکتے۔ کوئی بات نہیں۔

ہم تمہیں، ایسا کام نہیں دے گا۔

تمہارے ذمہ۔ ڈپو کی حفاظت ہو گی۔ وہ ذرا رُکے۔ اسکی طرف دیکھا کیا تم ہمیں، اپنے پچھلے کاغذات دکھا سکتے ہو۔ کیا تمہارے پاس تمہاری شناختی کتاب ہے۔

ریٹائرڈ سپاہی۔ جلدی سے اندر کی طرف لپکا۔ اور جب آیا، تو اس کے ہاتھ میں تین چھوٹی چھوٹی کتابیں تھیں۔

صاحب نے یہ کتابیں دیکھیں۔ افسروں نے سپاہی کے متعلق بڑی اچھی رپورٹیں لکھی تھیں۔ اس کا کردار بھی، اچھا دکھایا گیا تھا۔

یہ کتابیں، صاحب نے، اسے واپس کر دیں اور دونوں نوٹ، ایک بار پھر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے حکم دیا۔

ساتھ کی بستی سے، کم سے کم دو درجن انڈے۔ اور کچھ مرغے خرید لاؤ۔

اور پھر ایک دعوت کا انتظام کر دو۔

آج رات ہم یہیں رہیں گے۔

تم کسی آدمی کو بھیج کر، ہماری موٹر، کو کسی ایسی جگہ کھڑی کرا دو۔ جہاں

سے اسے، لڑ بھکایا نہ جا سکے۔

اس نے نوٹ لینے سے پھر انکار کرنا چاہا۔ مگر صاحب نے اسے ڈانٹا۔

اب ہم تمہارے مہمان نہیں تمہارے افسر ہیں، ہم اس علاقہ کی بریگیڈ یئر کے سب سے بڑے افسر ہیں۔

سمجھے۔ اور یہ ہمارا حکم ہے۔

اس نے سیلوٹ مارا۔ اور نوٹ لے کر، تھوڑے فاصلے پر آباد بستی کی طرف بڑھ گیا۔ صاحب، ایک بار پھر اس کمرے کی طرف آئے جہاں زمرد بیگم تھی۔ وہ کپڑے پہن چکی تھی، اپنے بکھرے ہوئے بال سلجھا لئے تھے۔ نہ جانے کیوں اس کی نگاہوں میں ایک عجیب قسم کا حجاب، ایک خاص شرم اور ایک نیا احساس جھلک رہا تھا۔ اس کی زرد زرد گہری گہری آنکھیں، آگ کی روشنی میں بہت کافی سُرخ ہو گئی تھیں۔ اور ان میں کچھ اس طرح کے لال لال ڈورے کھنچ گئے تھے جیسے۔ اس نے شراب پی رکھی تھی وہ اسے دیکھ کر مسکرائے۔ پوچھا،

اجازت ہو تو اندر آجائیں۔

اس نے انہیں دیکھ کر سر جھکا لیا۔ یہ عورت کی پہلی کمزوری تھی۔ دوسری کمزوری اس سے اس وقت ظاہر ہوئی جب انہوں نے، اپنی براندی اُتار کر اسے پہنائی۔ اس کا اُتارا ہُوا سویٹر اور کوٹ خود پہنا۔ اور اسکا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر، باہر آئے۔

باہر دور اوپر، سورج، کا شرمایا شرمایا چہرہ۔ آسمان پر پھیلی چھوٹی چھوٹی بدلیوں میں سے کبھی کبھی جھانک لیتا، اور کبھی پھر چھپ جاتا۔ سورج کے چمکنے سے فضا، کا حسن پہلے سے کہیں بڑھ گیا تھا، کہر کا دھندلا دھندلا پن ختم ہو چکا تھا اور ایک

عجیب قسم کی تابناکی اور دلفریب شوخی، ہر سو بھیل رہی تھی۔

وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے کبھی، اسے، ڈھلوانوں پر پھیلے چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں لے گئے، کبھی، زمین کی چھاتی سے پھوٹنے والے چشموں پر لا کھڑا کیا۔ اور اس کی شائد اپنی کوئی مرضی نہ تھی۔ یا اسے۔ اپنی ذات پر حد سے زیادہ اعتماد تھا۔ وہ اس طرح ان کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ جیسے وہ ان کی پرسنل اسسٹنٹ تھی۔

سورج، دور اوپر پھیلی چوٹیوں کے پیچھے جا چھپا۔ فضا کی شوخی، متانت اور سنجیدگی میں بدل گئی۔ اور وہ جس وقت اپنی چھوٹی سی قیام گاہ پہ آئے۔ تو فضا کافی حد تک دھندلا چکی تھی۔ ہٹ کے باہر۔ بنے ہوئے احاطہ میں۔ ہر طرف چھوٹے چھوٹے الاؤ جل رہے تھے۔ اور کتنی دیہاتی لڑکیاں اور لڑکے، لوہے کے مچھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑے سالم مرغ روسٹ کر رہے تھے۔

وہیں باہر ہی، ان دونوں نے، ان دیہاتی لڑکوں، لڑکیوں، میں بیٹھ کر رات کا کھانا کھایا۔ اور پھر اسی کمرے میں آ گئے۔ جہاں دوپہر کے چند لمحے گزارے تھے۔ انگیٹھی میں اب بھی آگ جل رہی تھی۔ اور اس سے تھوڑے فاصلے پر، اس بار ایک کی بجائے ساتھ ساتھ دو قالین بچھے تھے۔ ان پر، بھیڑوں کی کھالیں۔ ان کو زیادہ آرام دہ بنانے کے لئے ڈال دی گئی تھیں۔ انہوں نے، ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک عجیب محویت سے مسکرائے۔ اور پھر آپ، ہی آپ، ان کھالوں پر بیٹھ گئے۔

سرفراز خاں کی نوجوان بیوی، ان کے اوڑھنے کے لئے۔ دو لحاف لے آئی، اور ان کے قریب رکھ کر پچھلے پاؤں لوٹ گئی۔ جاتی دفعہ کمرے کا دروازہ بند کرتی گئی اور ان دونوں نے ایک دفعہ پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ دونوں کی

خود اعتمادی، شائد کسی قدر متزلزل ہو گئی تھی۔ کہ دونوں ایک دوسرے سے آنکھیں دو چار نہ کر سکے وہ عورت تھی۔ اور بریگیڈیئر صاحب مرد، عورت نے لحاف اُٹھائے۔ ایک لحاف ان کے بستر پر رکھا، دوسرا آپ لیا۔ برانڈی اُتار ڈالی۔ لحاف اوڑھا۔ اور آگ کی طرف منہ کر کے، زمین پر دونوں گھٹنوں کو ٹیک کر، اپنے سینہ کا بوجھ ان گھٹنوں پر ڈال دیا۔ اور پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ احتیاط کے دامن کی ہر گرہ، اس بڑے مرد کے کردار کی آزمائش کے لئے ڈھیلی کر دی گئی۔

مگر وہ خالص سونا تھا، اس جلتی کٹھالی میں رات بھر پگھلتا رہا۔ اور صبح جب سورج نے، اس حسین دادی پر اپنی سنہری کرنیں پھینکیں۔ تو وہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ زمرد نے اپنا حسین اور تابناک چہرہ لحاف سے باہر نکالا۔ اسکے سنہرے چمکیلے بال، کسی قدر الجھ گئے تھے۔ اس نے لحاف کا کونہ ایک طرف سرکا کر ان کو دیکھا۔ وہ ریوالور کی مٹھی اپنے مضبوط ہاتھ میں پکڑے۔ اسکی نالی اپنے سینہ کی طرف کئے تھے۔ وہ لرز گئی۔ اس نے انتہائی گھبراہٹ کے ساتھ انہیں پکارا۔ وہ مسکرائے۔ اور اسکے حسین چہرہ پر پھیلے اضطراب کو دیکھکر۔ اطمینان دلایا۔

کوئی بات نہیں، کٹھالی میں پگھلنے والے سونے میں کچھ زیادہ کھوٹ نہیں ملا تھا۔ ورنہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شائد یہ ریوالور، کبھی کا خالی ہو چکا ہوتا۔

ان کی آواز شائد کسی قدر بلند ہو گئی تھی۔ ساتھ کے کمرے میں ایک پتلی سی دیوار کے پیچھے بیٹھے ریٹائرڈ سپاہی نے یہ الفاظ سن لئے تھے۔ اور وہ اپنے سادہ سے دماغ کی مدد سے ان الجھے ہوئے الفاظ کو معانی کا جامہ پہنانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

تیرہواں باب

اس رات نے۔ ان دونوں میں ایک عجیب رابطہ، ایک نرالا تعلق پیدا کر دیا تھا زمرد تو کچھ اس طرح سمجھنے لگی تھی جیسے اسکی زندگی ایک بہت بڑے ٹھیراؤ پر پہنچ کر رُک گئی ہے۔ جیسے، اسکی اُمیدوں، آرزوؤں نے ایک نیا جامہ پہن لیا ہے۔ وہ اب بھی، منّو کا ہر آن انتظار کرتی، لیکن وہ ہر روز کی طرح اب خط پوسٹ نہ کرتی۔ البتہ جب بھی، ادور سیز سے ڈاک آتی، وہ آنکھوں میں ہزار اضطراب بھر کر بریگیڈیر لقمان سے پوچھتی۔

بریگیڈیر صاحب کیا، محاذِ جنگ سے آنے والی کسی چٹھی میں، منّو کے متعلق کوئی خبر نہیں ہے۔

بریگیڈیر آنکھیں جھکائے ہوئے جواب دیتے۔

اگر ایسی کوئی خبر ہوتی، جس سے تمہاری خوشی بڑھائی جا سکتی۔ تو میں ہزار ڈھول پٹواتا۔ پورے ملٹری بینڈ کو حکم دیتا۔ خوشی اور مسرت کا ترانہ گائے۔ فوجیوں سے کہتا۔ اس خوشی میں پریڈ کریں۔

زمرد خاموش ہو جاتی، اور اس کے دل میں بریگیڈیر لقمان سے متعلق ایک نیا احترام پیدا ہو جاتا۔ وہ سوچتی۔

ان کا کردار کتنا اونچا، اور ان کا ضمیر کتنا پاکیزہ ہے۔

ابھی اس نے یہ اونچا کردار، اور یہ اونچا ضمیر پوری طرح دیکھا نہ تھا۔ ابھی اسکی پوری آزمائش نہ کی تھی۔ وہ رات جوان دونوں نے وہاں اکٹھے بسر کی تھی۔ یقیناً ایک

بڑے امتحان کی رات تھی اور بریگیڈیئر صاحب اس امتحان میں پورے اتر گئے تھے مگر ابھی ایسی راتیں اور آنے والی تھیں۔ یہ تو ابھی تمہید تھی ایک نئے دور کی۔

بریگیڈیئر صاحب کو نہ جانے کیا وہم ہو گیا تھا۔ ان کے دماغ میں کیا دُھن سمائی تھی کہ وہ ہر تیسرے چوتھے، اس پہاڑی کا رخ کرتے، وہاں، زمرد کے ساتھ، دن بھر شکار کھیلتے اور رات، اسی ہٹ میں بسر کرتے۔ گو ہر داور اب بھی انکے ساتھ ہوتا لیکن اس میں وہ گریباں نہ ہوتے۔ انہیں اپنی ذات پر بھروسہ تھا۔ ان میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کتنی دیر تک زمرد کے ساتھ بیٹھے، کوئی کتاب پڑھتے رہتے زمرد پہلے سو جاتی۔

اس کا خوبصورت اور انتہائی دلفریب چہرہ ننگا ہوتا۔ وہ منہ کو نہ ڈھانکتی۔ انگیٹھی میں جلنے والی آگ، اس کے اس خوبصورت چہرے کو، پہلے سے ہزار گنا زیادہ دلفریب بنا دیتی۔ اسکی لانبی لانبی مست آنکھیں گو بند ہوتیں لیکن اس کی لانبی لانبی گھنی پلکیں ان آنکھوں پر کچھ اس طرح سایہ ڈالتیں کہ بریگیڈیئر صاحب دل پر ہاتھ رکھ لیتے۔ اور سوچتے، پروردگار کا یہ کتنا بڑا کرم ہے کہ یہ وجود، جسے وہ حاصل کائنات سمجھتے۔ یوں ان کے قریب ہے۔ یہ انکی معراج تھی۔ انکی محبت کی انتہا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ چاہتے نہ تھے، نہ جانے کیا بات تھی۔ زمرد، جب بھی کروٹ بدلتی، اس کا چہرہ، انکے سامنے رہتا۔ وہ اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے رات کی اوقات کیا ہوتی۔ یہ بہت جلدی بیت جاتی، اور صبح جب سورج طلوع ہوتا اور زمرد آنکھیں کھولتی۔ تو بریگیڈیئر صاحب، گاؤ تکیہ کے سہارے، بیٹھے، اس کے چہرے کو تکتے ہوتے وہ بے اختیار مسکرا دیتی۔

زمرد ان کے اس طرح اسے دیکھنے اور آپ مسکرا دینے میں ایک عجیب لطف

پانے لگی تھی۔ مگر وہ، ہر لطف کے باوجود، دن بدن کمزور ہوتے جا رہے تھے یہاں تک کہ انہوں نے اپنی گرتی ہوئی صحت کی بنا پر چھ مہینے کی چھٹی لے لی، اور اس بستی میں آن بسے، جو کاغان وادی میں ان کی محبوب پناہ گاہ تھی۔ انہوں نے۔ پن چکی کو چلانے والے نالے سے تھوڑے فاصلہ پر ایک مختصر سا ہٹ تعمیر کر لیا تھا اور زمرد کے ساتھ، پوری سادگی اور پوری خود اعتمادی کے ساتھ رہنے لگے تھے۔

اب ان کی ہر رات ایسی ہی گزرتی، سردی پہلے کی نسبت زیادہ بڑھتی جا رہی تھی، رات بھر برف گرتی، اور ان کے کمرے میں بنی پتھروں کی انگیٹھی میں رات بھر من من، آدھ آدھ من کے لکڑی کے ٹکڑے جلتے رہتے۔ ان کی تپش میں زمرد کا چہرہ آسمانوں پر بسنے والی اربوں حوروں کے مجموعی حسن سے ان گنت گنا زیادہ خوبصورت دلفریب اور پیارا نظر آتا....... اور وہ رات بھر اسے دیکھتے...... رہتے صبح صرف چند گھنٹے کے لئے جب زمرد سو کر اٹھ بیٹھتی تو وہ رات بھر جاگنے کے سبب، اپنا سر گاؤ تکیے پر رکھ دیتے۔ اور انکی بے تاب آنکھیں بند ہو جاتیں۔

وہ یہاں آئے تو اس لئے تھے کہ انکی گرتی ہوئی صحت اس مرغزار میں پہنچ کر سنبھل جائے گی۔ لیکن اس رات رات بھر کے جاگنے اور اس ہولناک ضبط نے، ان پر پہلے سے بھی برا اثر کیا۔ انکی کمر میں خم پڑ گئے۔ اور بال وقت سے پہلے سفید ہونے لگے۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی۔ زمرد کی جوانی پہلے سے زیادہ شوخ ہوتی جا رہی تھی۔ اس وادی کی تر و تازہ آب و ہوا، نے اس کے چہرے کی ساری زردی چھین لی تھی، سینہ پہلے سے زیادہ ابھر آیا تھا۔ آنکھوں کی مستی ہزار گنا بڑھ گئی تھی۔ بریگیڈیر صاحب کو تو تنقید کا ہوش نہ تھا، البتہ صاحب داد خاں کبھی کبھی زمرد بیگم کو یوں نکھرتے دیکھ کر

اس سے پوچھنا۔

بیگم صاحب، آپ۔ مجھ سے اور صاحب سے چھپ چھپ کر کیا ایسی چیز کھاتی ہیں کہ آپ، یوں جوان ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

اور۔

آگے کی بات، زمرد پوری کر دیتی۔

اور تم دونوں بوڑھے اور کمزور ہوتے جا رہے ہو۔ کیا تمہارا مقصد یہی تھا نا۔

صاحب داد خاں سر ہلا دیتا اور زمرد بچوں کی طرح ہنس کر جواب دیتی۔

صاحب داد خاں! خدا کی قسم بڑے احمق ہو تم بھی کہ یہ اتنی سیدھی سادی بات مجھ سے پوچھ رہے ہو، اس خوبصورت ماحول، ان سبزہ زاروں، ان ہرے بھرے کھیتوں اور اونچی اونچی چٹانوں اور بڑے بڑے پتھروں سے نہیں پوچھتے۔

صاحب داد خاں، احمقوں کی طرح، اپنے چاروں طرف پھیلے ماحول کو دیکھنے لگتا۔ اس ماحول کو تو وہ پورے پانچ مہینے سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس ماحول نے تو خادم اور مخدوم میں کوئی بہتری پیدا نہ کی تھی۔ اور وہ کچھ اور پوچھے بغیر سوچنے لگتا۔

کیا بیگم صاحب نے ہم دونوں کو پتھروں سے تو تشبیہ نہیں دی۔

زمرد نے یقیناً ان دونوں کو ان پتھروں سے مشابہ ٹھیرایا تھا۔ وہ دونوں پتھر ہی تو تھے۔ جو اس ماحول کے حسن اور اس آب و ہوا سے فیض نہ پا رہے تھے۔ یہ بات۔ بریگیڈیئر صاحب کو بھی تسلیم تھی۔ لیکن انہوں نے کبھی اس صاحب داد خاں کی طرح سوچا تھا۔ اور نہ کبھی زمرد سے اس سلسلہ میں کوئی بات پوچھی تھی۔

البتہ اس رات جب، باہر چاندنی چٹکی تھی۔ فضا، کہر سے بھری تھی۔

ان کا جی بہت چاہا۔ سوتی زمرد کو جگا دیں۔ اور اس سے پوچھیں۔
زمرد۔ تم ہر رات اسی طرح سوتی رہتی ہو۔ اور ہم جاگتے رہتے ہیں۔ کیا تمہارا جی کبھی اس بات کیلئے نہیں چاہا۔ کہ تم بھی، چند لمحے، ہماری طرح جاگو۔
مگر یہ بات کہنے کی ان میں جرأت۔ نہ تھی۔ یہ بات بھی کمزوری کا ایک طرح سے اعتراف تھی۔ یہ بھی تو عجز کو تسلیم کرنا تھا۔ انہوں نے اس سے یہ بات نہیں کہی۔ البتہ آپ۔ چاندنی کا تماشہ کرنے باہر آ گئے۔

یہ چاندرات، بڑی دلفریب اور سکون بخش تھی۔ لمبے لمبے چیل کے درخت۔ انہیں، ایک عجیب ازلی، ابدی گیت سناتے محسوس ہوئے۔ اور وہ باہر کھڑے کھڑے سوچنے لگے۔

کیا یہ میری تنگ ظرفی نہیں کہ میں۔ اس وسیع حسن، اس ابدی اور ازلی سکون کو نظرانداز کر کے، محض ایک عورت کی ملاحتوں میں الجھا ہوں۔ اس عورت کی ملاحتوں میں جو میری نہیں کسی دوسرے کی ہے۔

یہ احساس، اس پورے وقفہ میں پہلی بار انہیں ہُوا۔ اور انہیں آپ اپنے اوپر تعجب ہُوا، انہوں نے اس سے پہلے، کیوں کبھی اتنی بڑی بات نہیں سوچی۔ کیوں زمرد کی طرح، اس حسین ماحول کے سامنے جھولی نہیں پھیلائی، کیوں اس کے پھولوں، کلیوں، ندیوں نالوں اور سبزے سے سکون کی بھیک نہیں مانگی۔

یہ عجیب بات سوچتے، وہ آپ ہی آپ، اپنے اس ہٹ سے، دور ہوتے چلے گئے۔ وہ کبھی کھیتوں میں پھرے۔ پودوں کی شاخوں اور پتوں سے باتیں کیں۔ کبھی چیل کے درختوں سے لپٹ لپٹ کر قدرت کی تعریف میں گیت گائے۔

ان پر ایک عجیب دیوانگی طاری تھی اور انہیں یہ ہوش نہ رہا تھا کہ چاند کے چمکیلے چہرے اور ان کے مابین پھیلی فضا میں اودے اودے رنگ کی کہر چھا گئی ہے۔ ہر چہار سو، برف کے گالے اُڑنے لگے ہیں۔ گو اس سے فضا پہلے سے بھی زیادہ رنگین ہو گئی تھی۔ اس سے قدرت کا حسن اور زیادہ قاتل اور جاذب بن گیا تھا۔ لیکن ان کا نحیف اور کمزور جسم ایک خوفناک لرزے میں مبتلا تھا۔

پھر چاند دور اوپر پہاڑ کی چوٹیوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اور انہیں ایسا لگا جیسے کوئی ان ہونی بات ہو گئی۔ اب انہیں اپنے لرزتے جسم اور یخ بستہ اعضا کا احساس ہوا۔ وہ ہولے ہولے، قدم اُٹھاتے پیچھے کو مڑے۔ وہ دور نکل آئے تھے۔ اور ان کی راہ ان پر گم ہو گئی تھی۔ ان کے پاس نہ ٹارچ تھی۔ نہ دیا سلائی وہی چیل کے درخت جن سے باتیں کرتے۔ وہ اتنی دور تک آئے تھے۔ انہیں ہزار ہزار قسم کی خوفناک شکلیں بدلنے محسوس ہوتے لگے تھے۔

وہ بڑے جری، بڑے جنگجو اور نڈر آدمی تھے۔ لیکن اس وقت انکی ساری جرأتیں سارے حوصلے۔ اپنے چاروں طرف پھیلے ماحول سے شکست کھا گئے تھے۔

اس لمحے ان کے منجمد سینہ میں رکیے دھک دھک کرتے دل میں اگر کوئی شمع روشن تھی۔ تو وہ زمرد کی محبت تھی۔ اور ان کا ڈوبتا دل، ہر بار یہی چاہ رہا تھا۔ ہائے وہ کسی طرح اس زمرد کے حسین چہرے کو ایک بار دیکھ سکیں اور اسکے نازک نازک پاؤں پر گر کر اس سے ہزار عذر کے ساتھ معافی چاہیں۔

اور یہ زمرد، اچانک سوتی سوتی جاگ اُٹھی۔

دیوار میں بنی انگیٹھی میں جلنے والی لکڑیاں گو ساری کی ساری جل چکی تھیں،

لیکن کو ٹلے تیزی سے دہک رہے تھے اور ان کی روشنی میں اس نے چاروں طرف دیکھا بریگیڈیئر صاحب کے پلنگ کو خالی پاکر وہ اپنے پلنگ سے یوں اُٹھی جیسے اسے ہزاروں بچھوؤں نے ایک ساتھ ڈس لیا تھا۔ وہ دیوانہ وار باہر کو لپکی۔

باہر برف پوری شدت سے گر رہی تھی۔ اور بریگیڈیئر صاحب کہیں کھڑے نظر نہ آتے تھے۔ اس نے آج پہلی بار، انہیں اس طرح پکارا، جس طرح ایک محبت کرنے والی عورت اپنے محبوب کو پکارتی ہے۔

مگر اس کی کمزور آواز جھیل کے لمبے لمبے درختوں اور ان کی شاخوں کے ساتھ لپٹنے والی برف میں جم کر رہ گئی۔

صاحب داد خاں، اور دوسرے ملازم البتہ جاگ اٹھے تھے اور لالٹینیں ہاتھوں میں پکڑے اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔ اور وہ بال نوچ نوچ کر ان سے کہہ رہی تھی۔

صاحب نہ جانے کہاں چلے گئے۔

پھر صاحب داد خاں اور سارے ملازم، اس کو گھیرے میں لئے۔ برف باری کے اندر بریگیڈیئر صاحب کو ڈھونڈنے چلے۔ اور کوئی آدھ گھنٹہ کی جستجو کے بعد جب بریگیڈیئر صاحب جھیل کے درختوں کے سہارے آگے کو قدم بڑھاتے انہیں نظر آئے تو برف باری کے باوجود ان سب کے جسم جلتی بھٹیوں کی طرح جلنے لگے۔ اور اس زمرد کو تو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ وہ ان سے اس طرح لپٹ گئی تھی جیسے ہزاروں سال کے فراق کے بعد ان سے ملی تھی۔

مگر انہیں کچھ ہوش نہ تھا۔ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکے تھے کہ ان کے یخ بستہ جسم کے ساتھ زمرد لپٹی ہے۔ یا جھیل کے درختوں کی ٹیڑھی ٹیڑھی شاخیں انہیں آگے

بڑھنے سے روک رہی ہیں۔ صاحب داد خاں نے۔ زمرد کو زبردستی ان سے پرے ہٹا کر انہیں اپنی پیٹھ پر لادا۔ اور ڈوبتے ڈوبتے دل کے ساتھ ہٹ کی طرف بھاگا۔ زمرد بھی ساتھ ساتھ بھاگی۔ دوسرے ملازم بھی بھاگے۔

انگیٹھی میں دھڑا دھڑ لکڑیاں جلنے لگیں۔ زمرد اور صاحب داد خاں، رات بھر ان کے جسم پر برانڈی کی مالش کرتے رہے۔ مگر وہ ابھی تک پوری طرح ہوش میں نہ آئے تھے۔ وہ کبھی کبھی آنکھیں کھول لیتے۔ اور عجیب کھوئے کھوئے انداز میں بڑبڑاتے . . . . میری . . . . راہ . . . . . نہ روکو . . . . مجھے اس کے پاس . . . . ———

میں اس . . . . کے پاؤں . . . . سر . . . . رکھ . . . . . . کر۔

اس سے . . . . میں نے شر . . . . ک . . . .

وہی . . . . . . میر . . . . ی . . . . شمع۔

ان کی آنکھیں پھر بند ہو جاتیں۔ اور زمرد، ان کے بند ہونٹوں پر برانڈی کے قطرے ٹپکا ٹپکا کر ان سے کہتی۔

میں زمرد ہوں۔ یہ صاحب داد خاں ہے۔ آپ ہم سے کہئیے آپ کہاں جانا چاہتے ہیں

مگر وہ کچھ نہیں کہتے ——— جو ڈرائیور، ان کی موٹر کو تیز تیز دوڑاتے، ہزارہ کی طرف بھاگ رہا تھا گو اسے کہر کی وجہ سے، رستہ صاف نہ دکھائی دیتا تھا لیکن اس کا جذبہ ان دونوں سے کسی طرح کم نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا اڑ کر ہزارہ پہنچ جائے اور وہاں کے بڑے ڈاکٹر کو لے کر۔ اڑتا ہوا لوٹ کر آئے۔

مگر وہ اڑتا ہوا، نہ جا سکا اور نہ اڑتا ہوا آ سکا۔ وہ جب لوٹ کر

ڈاکٹر کو لے کر وہاں آیا۔ تو صبح کے دس بج چکے تھے۔۔ اور بریگیڈیئر صاحب، پہلے ہی کی طرح بے ہوش پڑے تھے۔

ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر زمرد اس کے پاؤں پر گر گئی۔ اور اس وقت صاحب داد خاں نے جانا۔ اس زمرد کو بریگیڈیئر صاحب کتنے عزیز تھے۔

ڈاکٹر کی کوئی گھنٹہ بھر کی جدوجہد کے بعد جب بریگیڈیئر صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ اور زمرد کو ٹپ ٹپ آنسو بہاتے پایا تو رُکتی رُکتی آواز میں پوچھا۔

یہ آپ۔۔۔۔۔ رو کیوں رہی ہیں۔ یہ، اتنے سارے لوگ۔ یہاں۔

کیوں۔۔۔۔۔ آئے ہیں۔۔۔۔۔ ——

زمرد پہلے سے زیادہ بے قراری کے ساتھ رونے لگی، تو انہوں نے صاحب داد خاں پر توجہ کی۔

صاحب داد خاں، ان سب لوگوں کو یہاں۔۔۔۔۔۔۔ سے نکال کیوں —— نہیں دیتے۔ یہ ہمارے کمرے میں۔۔۔۔۔۔ کیوں آن جمع ہوئے ہیں۔ کیا تم نے ان سے نہیں کہا۔

ہم اس ایریئے کے بریگیڈیئر ہیں۔

زمرد کی سسکیاں پہلے سے بڑھ گئیں۔ اور وہ دفعتاً رک گئے۔ بات پوری نہیں کر سکے۔ ڈاکٹر نے آگے کو بڑھ کر صورتِ حال بدلنے کی کوشش کی۔

بریگیڈیئر صاحب! میں ہزارہ کا سول سرجن ہوں۔ میں آپ کے علاج کے لئے آیا ہوں۔

بریگیڈیئر صاحب نے ڈانٹا!

لیکن آپ کو یہاں کون لایا ہے ۔ میری اپنی بریگیڈ میں کئی بڑے ڈاکٹر ہیں کئی لفٹننٹ کرنیل اور کرنیل ہیں ۔ آپ کیوں آئے ۔

ڈاکٹر نے ۔ وضاحت کی ۔

آپ رات برف باری میں باہر نکل گئے تھے اور برف ......

وہ چیخے ۔

تم جھوٹ بولتے ہو ۔ میں نے اپنے کمرہ سے باہر قدم نہیں رکھا ۔ میں نے ایک لمحہ کے لئے بھی ۔ اپنی زمرد کو تنہا نہیں چھوڑا ۔ میں اسے اگر چھوڑ کر باہر چلا جاتا تو اسی گھڑی ، موت مجھے آن دبوچتی ۔ یہی تو میری زندگی ہے ۔ اسی سے تو میری روح کی ڈوری بندھی ہے ۔

زمرد کی سسکیاں ، پہلے سے بھی بڑھ گئیں ۔ اور انہوں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھا ۔

یہ تم کو کس نے کچھ کہا ۔ یہ کس نے تمہارے حضور گستاخی کی ۔ مجھ سے اس کا نام لو ۔ میں اسے ابھی گولی مار دوں گا ۔

مگر وہ اٹھ نہ سکے ۔ ان کا سارا جسم پلاسٹر سے بوجھل ہو رہا تھا ۔ انہوں نے پلاسٹر کو جسم سے نوچنے کی کوشش کرتے ہوئے احتجاج کیا ۔

یہ میرا جسم کس نے یوں جکڑ رکھا ہے ۔ یہ تم لوگوں نے ایسا کیوں کیا ہے

یہ ایک عجیب بحرانی کیفیت تھی ، جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے ۔ اور جب ڈاکٹر نے ۔ صاحب داد خاں کی مدد سے ، انہیں پھر زبردستی پکڑ کر بستر پر لٹا دیا ۔ تو وہ اپنا سر زور زور سے پٹختے ہوئے چیخے ۔

خدا کی قسم میں تم سب کو گولی مار دوں گا۔ تم سب کا کورٹ مارشل کر دوں گا۔
مگر جب وہ اس دھمکی سے بھی نہ ڈرے۔ تو انہوں نے زمرد کو پکارا۔
زمرد ـــــ یہ تم ان لوگوں کو باہر کیوں نہیں نکال دیتیں یہ تم۔ میرے پہریداروں کو کیوں نہیں بلاتیں۔ تم۔ میری بریگیڈ میں ٹیلیفون کیوں نہیں کرتیں یہ لیٹرے گستاخ میرے بنگلے میں گھس آئے ہیں۔

ان سے کہو۔

زمرد۔

میں اس ایریئے کا بریگیڈیئر ہوں۔ اور میرے اختیارات بہت وسیع ہیں۔

زمرد کی سسکیاں اچانک رک گئیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر انکے قریب آئی اور دونوں کو ہٹا کر، اپنے دونوں ہاتھ انکے چہرے پر رکھ دئے۔ اور وہ بچوں کی طرح رونے لگے اور رو رو کر اس سے احتجاج کرنے لگے۔

ان سب لوگوں کو یہاں سے نکال دو۔

ان کی یہ بحرانی کیفیت۔ روز بروز زیادہ ہوتی گئی۔ گو ان کے سینے کی پٹی کھل گئی تھی پلاستر اتار دیا گیا تھا۔ لیکن وہ ہر بار، اپنے ہاتھ اپنے سینہ پر لے جاتے اور زمرد سے چیخ چیخ کر کہتے۔ زمرد انہوں نے میرا سینہ لوہے کی تختیوں میں جکڑ رکھا ہے۔ ان سے کہو۔ یہ تختیاں اتار لیں۔ ورنہ میں ان سب کا کورٹ مارشل کر دوں گا۔

یہی بات انہوں نے۔ اپنی بریگیڈ کے سب سے بڑے ڈاکٹر کرنل وگ۔ سے کہی جب وہ اپنے دو اسسٹنٹ ڈاکٹروں کی معیت میں انہیں دیکھنے آیا۔ کرنل وگ۔ نے انہیں ہزار اطمینان دلایا۔ بریگیڈیئر صاحب آپکے سینہ پر کسی نے کوئی تختی نہیں باندھ رکھی۔

مگر انہیں اطمینان نہیں ہوا۔ اور انہوں نے کرنل وگ سے شکوہ کیا۔

تم بھی انکے ساتھ مل گئے ہو۔ تم نے بھی ان کے ساتھ سازش کر لی ہے۔

میں تمہارا ابھی کورٹ مارشل کر دوں گا۔

انہوں نے اگر کسی کو اب تک کورٹ مارشل کی دھمکی نہ دی تھی تو وہ زمرد تھی۔ یا صوبیدار میجر سرفراز کی بیوی تھی وہ دونوں کے سوا ہر اس ڈاکٹر، یا دوسرے فوجی افسر کا کورٹ مارشل کرتے جو انہیں یہاں دیکھنے آتا۔

کرنل وگ کا اصرار تھا بریگیڈیر صاحب کو ایبٹ آباد واپس لے جائیں اور اس مقام پر انہیں نہ رہنے دیں۔ مگر زمرد، یہ نہ چاہتی تھی۔ وہ جو اس میں نہیں سکتے۔ سب لوگوں کے سامنے، انکے آگے سجدے کرنے لگتے۔ انکے پاؤں پکڑ کر اس سے ہزار ہزار معافیاں مانگتے۔ وہ اس سے کہتے۔ تو میری معبود ہے۔ وہ یہ عام رسوائی نہ چاہتی تھی۔ یوں بھی جب تیمار دار وہاں نہ ہوتے۔ وہ کسی قدر سکون میں رہتے۔ زیادہ ہیجان نہ ظاہر کرتے۔

کرنل وگ گو زمرد کا کہا مان کر، چار دن رہ کر واپس چلے گئے۔ لیکن، ہر دوسرے دن، باقاعدگی سے وہاں آتے۔ انکی علالت کی خبر چند مخصوص فوجی افسروں کے سوا کسی دوسرے سے نہیں کہی گئی تھی۔ ورنہ بریگیڈ کا ایک ایک سپاہی، انہیں دیکھنے کے لئے وہاں آن پہنچتا۔ پوری بریگیڈ ان کا بے حد احترام کرتی۔

وہ انجکشن نہیں لگواتے تھے۔ اس لئے کرنل وگ۔ انہیں چائے میں ملا کر دوا پلاتے کبھی کبھی تو وہ چائے کا پیالہ، پرے پھینک دیتے اور چیختے۔

زمرد ان سب نوکروں کو نکال دو۔ انہوں نے ہماری پیالی میں زہر ملا دیا ہے۔

یہ سب چاہتے ہیں۔ ہم مر جائیں۔ اور ان کا کورٹ مارشل نہ کر سکیں۔

اور اس شام جب انہیں اس بحران میں مبتلا ہوئے سات مہینے ہو چکے تھے۔ اور جولائی ۱۹۴۵ء کی پہلی تاریخ تھی۔ زمرد نے آپ اپنے ہاتھ سے چائے بنائی تھی۔ اس میں دوا ابھی شامل نہ کی تھی۔ لیکن یہ پیالی بھی انہوں نے پھینک دی۔ اور زمرد کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر احتجاج کیا۔

کیا تم بھی ان کے ساتھ مل گئی ہو۔ کیا تم بھی ان کے ساتھ مل کر مجھے زہر دے مار کر ڈالنا چاہتی ہو۔

یہ کہتے وقت ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ اور انہوں نے اپنا سر اس کے سامنے جھکا کر۔ رُکتی رُکتی آواز میں اس سے کہا۔

یوں اگر تم مجھے مارنا ہی چاہتی ہو۔ تو مار ڈالو۔ یہ موت بھی تو میری زندگی ہوگی۔

وہ آپ رو پڑی۔ اور اس نے اپنا سر ان کے کندھوں پر ڈال دیا۔ اور وہ کانپ کر پرے ہٹ گئے۔ اور چیخے۔

نہیں نہیں... تم اپنا جسم اس درجہ مجھ سے قریب نہ کرو۔ یہ جسم میرا نہیں ہے جسم تو فانی ہے۔ میں فانی چیزوں سے محبت نہیں کرتا۔

زمرد نے سر اُٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ ابھی تک کانپ رہے تھے اور انکی زرد زرد آنکھوں میں آنسو بہہ بہہ کر ان کے گالوں کو بھگو رہے تھے۔

چودھواں باب

آج ہی۔ جاپانیوں اور جرمنوں نے ہتھیار ڈالے تھے۔ آج ہی اتنی بڑی بات

وقوع میں آئی تھی اور آج ہی نزہت جہاں بیگم دوسری بار دلہن بنی تھی۔ وجاہت منزل کے چاروں طرف پھیلے لانوں میں عجیب رونق تھی۔ دہلی بھر کے شرفا، اونچے لوگ، اور فوجی افسر اس تقریب میں جمع تھے۔ یہاں تک کہ چھمی۔ اور میجر سلیم تک پیچھے نہیں رہے تھے۔ بریگیڈیئر آفتاب احمد کی برات جس وقت۔ دلہن کے ہاں پہنچی۔ تو۔ ملٹری کے فل بینڈ باجہ نے مبارک سلامت کا ترانہ گایا اور چھمی نے۔ سورن کے کان کے قریب۔ منہ لے جاکر طنز کی۔

شرم تو نہیں آتی ہوگی تمہاری سہیلی کو۔ ایک بچے کی ماں بننے کے بعد کیسی دھوم دھام سے دوسرا بیاہ کر رہی ہے۔

اگر تمہاری سہیلی ایسی ہی بے شرم ہو گئی تھی۔ تو اپنے پہلے خاوند۔ اور اپنے جان نثار عاشق میجر مشتاق احمد کو بھی بلا لیا ہوتا۔

یہ جشن وہ بھی تو دیکھ لیتے۔

سورن نے اسکی طنز کا جواب تو نہیں دیا۔ البتہ۔ اپنی طرف سے اطلاعاً عرض کیا۔ میں نے آپ ان دونوں کے نام دعوت نامے بھیجے۔ کنور صاحب نے تو کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ میجر مشتاق احمد نے لکھا۔ آنے کی کوشش کروں گا۔

پھر سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے حیرانی ظاہر کی۔

خدا جانے۔ کیوں نہیں آیا ذرا تم ہی تکلیف کر کے اسے ٹیلیفون پہ پوچھ لو۔ کہ اس جشن میں کیوں شامل نہیں ہوا۔

یہ چھمی بڑی حرافہ تھی۔ ہرنی کی طرح کلیل بھرتی ٹیلیفون اسٹینڈ کے پاس جا پہنچی۔ ٹیلیفون ریسور اٹھا کر میجر مشتاق احمد کا نمبر ملایا۔ اسی وقت۔ جب

میجر مشتاق کے ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے عجوبہ میں الجھا تھا۔ اس نے لفٹننٹ کرنل منّو کے گلے میں باہیں ڈال رکھی تھیں، احمق کبھی اس کی پیشانی چومتا اور کبھی اس کی آنکھوں پر اپنے سرزیدہ اور تپیدہ ہونٹ رکھ دیتا۔ یہ منّو آپ رو رہا تھا۔ اس کی کالی کالی آنکھیں جن کے گرد دو سال کی مسلسل قید نے سیاہ حلقے ڈال دیے تھے، آنسوؤں سے تر تھیں۔

لفٹیننٹ کرنل منّو نے کوئی پندرہ منٹ پہلے مشتاق احمد کے گھر پر دستک دی تھی۔ وہ رومانیہ سے ترکی اور ترکی سے کراچی کے راستے ابھی فلائی کر کے دہلی پہنچا تھا۔ اور اس وقت سے اب تک دونوں نے ایک دوسرے سے لپٹنے۔ ایک دوسرے کو چومنے چاٹنے کے سوا کوئی دوسری بات نہ کی تھی۔

ٹیلیفون کی گھنٹی متواتر بج رہی تھی۔ چھمی کو بھی ضد تھی۔ میجر مشتاق کے کان کے پردے پھاڑ ڈالے گی۔ میجر مشتاق نے تو نہیں البتہ منّو نے مشتاق سے خود کو چھڑا کر ٹیلیفون ریسیور منہ سے لگا کر پوچھا۔

ہم بھی تو جانیں۔

یہ کون اتنا ضدی ہے۔

چھمی کو ایسا لگا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ وہ اس آواز کو خوب پہچانتی تھی ہزاروں بار ٹیلیفون پر اس سے راز و نیاز کی باتیں کی تھیں۔ اس نے بہت زیادہ حیرت کے ساتھ۔ جواب دیا۔

یہ آواز تو میرے دل کو کچھ مانوس معلوم ہوتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ آواز۔

منو نے بھی چھمی کو پہچان لیا تھا۔ اسی انداز میں بولا۔

جی ہاں۔ یہ آواز منو کی ہے۔ جسے آپ لوگوں نے مل ملا کر محاذ پر بھیج دیا تھا۔ جسے اپنی دنیا سے نکال دینے کی بہت کوشش کی تھی۔ لیکن جو اتنا ڈھیٹ ہے کہ پھر آن پہنچا ہے۔ تاکہ آپ لوگوں کا محاسبہ کر سکے۔

چھمی گو ان دنوں میجر سلیم کے چکر میں تھی لیکن آخر اس منو کی جوانی سے بہت کھیلی تھی۔ اس کو اچانک یوں باتیں کرتے پا کر، انتہائی مسرت سے چیخی۔

یہ شکوے تو بعد میں بھی ہو سکتے ہیں یہ دھمکیاں تو پھر بھی دی جا سکتی ہیں۔ بس اس وقت آپ صرف اتنا بتا دیں کہ آپ میرے وہاں آنے تک کہیں اُڑ تو نہ جائیں گے۔

بس اسی قدر۔

منو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ چھمی سے ملنا اس کے پروگرام میں نہ تھا وہ تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ میجر مشتاق سے زرداد دہقان کا پتہ پوچھ کر آج ہی رات اپنی منزل مقصود کی راہ لے گا۔ لیکن چھمی کی یہ درخواست رد کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اس نے اس کے جواب میں صرف دو لفظ کہے۔

جی میں آپ کا انتظار کروں گا۔

چھمی نے ٹیلیفون ریسور رکھ دیا اور ناچتی اور کانپتی ہوئی سورن کے پاس آئی سورن مہمانوں میں الجھی تھی۔ چھمی نے اس کے کان کے قریب منہ کر کے اسے یہ حیرت انگیز خبر سنا دی۔ سورن کے گل نار چہرے پر نہ جانے کیوں، زردی کی ایک تیز لکیر کھنچ گئی۔ اور اسے ایسا لگا جیسے اس کے پاؤں تلے کی زمین

کانپنے لگی ہے۔ اس نے دنیم سلیم سے سول میرج کی تھی وہ اس کی بیوی تھی۔ دونوں میں محبت بھی تھی لیکن منّو کی یاد تو عجیب یاد تھی۔ منّو کا وجود تو عجیب وجود تھا وہ کانپتی کانپتی نزہت کے پاس بھاگی۔ نزہت آپ یہ خبر سن کر مسرت کا عجیب جھولا جھولنے لگی تھی اس کے چہرے پر زردی کی لکیر نہیں کھنچی۔ البتہ دلی مسرت کے سبب ایک نرالا نور جھلک آیا۔ ایسے جیسے اس نے اپنی شادی کی رات کوئی بہت بڑی لاٹری جیت لی ہو۔

مہمانوں کا تانتا بندھا تھا اور وہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ ابھی نکاح کی رسم ادا نہ ہوئی تھی۔ لیکن اس مسرت بخش نوید کو پاکر۔ اس کا جی چاہا۔ وہ اڑتی ہوئی منّو کے پاس جائے۔ اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر اس سے کہے۔

منّو! میں نے تمہاری خاطر تمہارے بھائی سے شادی کی، اس کا بچہ جنا۔ لیکن یہ شادی جو میں اب کر رہی ہوں۔ یہ میں نے اپنی خاطر کی ہے۔ کیا تم میری اس شادی میں شریک نہ ہوگے۔

تمہارے بغیر میری یہ شادی نامکمل رہے گی۔

جیسے ہی یہ خیال اسے آیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھی۔ اور نجم کو بلا کر حکم دیا۔ ذرا ڈرائیور سے کہو۔ موٹر زنانہ حصہ کی طرف لے آئے۔ ہم چند منٹ کے لئے باہر جائیں گی۔ نجم نے حیرت سے اس نزہت کی طرف دیکھا۔ اور سوچنے لگی۔

کیا بی بی اس شادی کو کہیں رد کرنا تو نہیں چاہتی۔

مگر بی بی نے نجم کو گم سے کھڑے دیکھ کر باہر کی طرف دھکیل کر حکم دیا۔

فوراً ابھی اسے میری خواہش سے آگاہ کر دو۔

اس کے کمرے میں سلمیٰ رحمان، آمنہ مجید ملک، مشتری، نوشابہ۔ صاحبزادی فخرالنسا۔ انوری۔ زفیعہ سلطان اور کتنی دوسری خواتین بیٹھی تھیں۔ ان کی طرف دیکھ کر اس نے چند منٹ کی اجازت چاہی۔

اور اپنے لباس خانہ میں پہنچ کر ذرنی لبادہ اوڑھا، جب تک وہ باہر آتی تھی سورن کو گھسیٹتی باہر لے جا چکی تھی۔ اور بریگیڈیر آفتاب احمد سے کہتی گئی تھی۔ ہم منّو کے پاس جا رہی ہیں۔ بریگیڈیر صاحب نے یہ خبر سنی۔ تو انہیں ایسے محسوس ہوا، جیسے ان دونوں نے ان کے سر پر ایٹم بم پھینک مارا ہے۔ مگر یہ ایٹم بم، پھٹا اس وقت جب وہ لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ دلہن کے کمرے کے پاس آئے اور نجم سے پوچھا، کیا نکاح کی رسم ادا کی جائے۔ بی بی تیار ہیں۔

نجم نے آنکھیں جھکا لیں۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ بریگیڈ صاحب کا دھک دھک کرتا دل۔ سینہ کی دیواریں توڑ کر باہر نکل آنے کو تھا۔ انہیں ڈر تھا۔ کہیں منّو کے آجانے سے یہ شادی رک نہ جائے۔ کہیں ...... یہ دولت ان سے پھر نہ چھین لی جائے۔ مگر انہیں ہمت نہ تھی کہ نجم سے صاف لفظوں میں کچھ پوچھیں مگر نجم ان کے چہرے پر چھائے ہر غم کی تہ پا گئی تھی۔ اس نے ان کا بازو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور ہولے سے سرگوشی کی۔

بی بی ابھی ابھی باہر گئی ہیں۔ جاتی دفعہ کہہ گئی تھیں صرف دس منٹ میں لوٹ آئیں گی۔

بہت جلدی میں تھیں اور اس طرح کانپ رہی تھیں۔ جیسے سخت بخار میں ہوں بریگیڈیر صاحب نے پھر کچھ نہیں پوچھا، ان کے دل پر منوں برف جم گئی تھی۔ اور دماغ شل ہو گیا تھا۔

باہر بینڈ باجہ ابھی تک مبارک سلامت کی لے چھیڑ رہا تھا۔

مہمان منتظر تھے کہ نکاح خوانی کی رسم ادا ہو۔ لیکن بریگیڈیئر صاحب لوٹنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ اور زنانہ حصہ کے برآمدہ میں پچھے ایک صوفہ پر یوں گرے پڑے تھے جیسے، سکرات میں مبتلا ہوں۔

اور یہ سکرات، اس وقت تو بجلی کے جھٹکوں میں بدل گئے جب کوئی پندرہ منٹ بعد، نزہو کی موٹر، بغیر کسی ہارن کے برآمدہ کے سامنے آن رُکی۔ وہ پہلے آپ اُتری، پھر منّو کو اُتارا۔ پھر سورن، چمکی اور پھر مشتاق کی باری آئی اور یہ سارے سارے جب برآمدہ میں بچھے صوفہ کے قریب پہنچے تو بریگیڈیئر صاحب ابھی تک کانپ رہے تھے۔ منّو نے انہیں گلے سے لگا کر سرگوشی کی۔

میں آپ کو مبارکباد دینے آیا ہوں کہ آپ کی دلی مراد بر آئی۔

بریگیڈیئر صاحب کے چہرے پر چھائی زردی، کافور ہوگئی۔ اور انہوں نے منّو کی پیشانی چوم لی۔

جب چند منٹ بعد مولوی صاحب نے نکاح خوانی کی رسم ادا کی، تو منّو نہ صرف نزہت کے گواہوں میں تھا بلکہ نکاح نامے پر نزہت کے ولی کی حیثیت سے دستخط ثبت کئے۔ اس نے نزہت کو گود میں بھر کر آپ، دولہا کی موٹر میں لادا۔ اور سورن کے سینہ پہ سر رکھ کر اس طرح رو دیا جیسے باپ اپنی بیٹی یا بھائی اپنی بہن کو رخصت کرتے وقت روتا ہے۔

چمکی بڑی حرافہ تھی، اسے یوں روتے پا کر سرگوشی کی۔
خدا کی قسم، اگر تم چاہتے۔ تو یہ شادی آخر وقت میں بھی رُک جاتی۔

پھر اب اس طرح رونے سے کیا حاصل۔

اس نے چھمّی کی اس بات پر اسے صرف اپنی روتی آنکھوں میں گھور کر دیکھا کوئی شکوہ نہیں کیا۔ البتہ تھوڑی دیر بعد جب چھمّی نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر ایک اور چوٹ کی۔

خدا جانتا ہے منّو تم بڑے بدنصیب ہو۔ نزہت یوں گئیں۔ اور زمرد کو تمہارے لقمان صاحب لے اُڑے۔

تو منّو بید مجنوں کی طرح کانپنے لگا، اس نے چھمّی کو اس کے گریبان سے پکڑ لیا اور چیخا۔

کیا تم سمجھتی ہو۔ زمرد بھی تم ایسی عورت ہے جیسے کوئی دوسرا یوں لے اُڑے۔

چھمّی، نے زور کا قہقہہ مارا۔ اور انتہائی بے پروائی کے ساتھ بولی۔

حضور۔ اس خوش فہمی میں نہ رہئیے کہ اس مادرِ گیتی نے آپ سے زیادہ خوبصورت مرد کوئی دوسرا پیدا نہیں کیا۔ آپ تو محض لفٹنٹ کرنل ہیں اور لقمان تو بریگیڈیر ہیں بریگیڈیر اور زمرد تو ــــــ

اس نے اس سے آگے چھمّی کو کوئی بات کہنے نہیں دی۔ اسکے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اسے بڑی طرح جھنجھوڑا۔ اگر سورن مداخلت نہ کرتی تو وہ اس چھمّی کو جان سے مار ڈالتا۔ سورن نے چھمّی کو اس سے چھڑایا۔ مگر یہ اتنی ڈھیٹ تھی کہ ابھی تک ہار نہ مانی تھی اور چیخ رہی تھی۔

یہ تو حضرت تمہیں میری بات کی سچائی کا پتہ اس وقت چلے گا جب تم اپنی آنکھوں سے . . . .

وہ پھر اس پر لپکا۔ مگر سورن نے۔ اس کی راہ روک لی اور نجم کو پکارا۔

نجم۔ ذرا منّو کے بھتیجے اور نزہت کے بیٹے کو تو یہاں لے آؤ۔

نزہت نے اپنے اس بیٹے۔ اپنی شادی اور کتنی اور باتیں۔ منّو سے کہہ دی تھیں۔ سورن نے جیسے ہی اس بچے کو لانے کا حکم دیا۔ منّو کا غصہ، دھیما پڑ گیا۔ اور وہ سوچنے لگا۔

نزہت نے اس کی خاطر کتنی قربانی کی۔

یہ بچہ بالکل اس کے بھائی منصور احمد کا ہم شکل تھا۔ اسے دیکھ کر منّو کو ایسا لگا جیسے منصور احمد پینتیس سال کو روئی کی طرح دھنتے آکھ جھپنے کے اس بچے کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ اس نے اس بچے کو جب گود میں لیا۔ تو اس کے خون میں ایک عجیب کھولاؤ پیدا ہوا اور آنکھیں بہنے لگیں۔

بجی۔ دور کھڑی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ وہ پھر شرارت سے باز نہ رہی اور منّو کو روتے دیکھ کر چیخی!

منّو سچ کہنا، کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ اس بچے کے باپ تم ہوتے۔

منّو اس پر لپکا نہیں، صرف اسے دیکھا اور نہ جانے کیسے اسے ایسا لگا جیسے یہ حرافہ بجی اس کے دل کے کسی کونے میں چھپی خواہش کا اظہار کر رہی ہو۔ جیسے بجی نے، اس چنگاری کو ہوا دے دی ہے۔ جو اس کے نہاں خانہ دل میں، بہت دور کہیں دبی تھی۔

یہ ایک عجیب انکشاف تھا۔ اس سے تو وہ آپ کبھی اس سے پہلے آگاہ نہ ہوا تھا۔ اس نے تو کبھی ایک لمحہ کے لیے یہ محسوس نہ کیا تھا کہ نزہت اس کی بیوی بن

سکتی اور اس کے لیے ایک بچہ جن سکتی ہے۔

البتہ تھوڑی دیر پہلے، جب زہرہ نے اپنی حسین اور گداز باہیں، اس کے گلے میں ڈال کر اس سے سرگوشی کی تھی۔

"شنو، میں نے تمہارے بھیا سے محض اس لیے شادی کی کہ تمہارے خاندان میں پہنچ جاؤں اور تمہاری جائداد اور تمہاری شفقتیں تمہارے نام پھر کرا دوں۔"

تو اس کے دل میں عجیب عجیب طوفان اٹھنے لگے تھے۔ اس وقت اسے ٹھیک طور پر یہ محسوس نہ ہوا تھا یہ طوفان کیوں اٹھ رہے ہیں۔ یہ ہیجان کیوں اس زور لاوے کی طرح ابلنے لگا ہے۔ اس طوفان کی غرض و غایت تو اس شریر بچی نے یہ نئی بات کہہ کر اس پر واضح کی۔ اس نے اس بچے کو اس طرح اپنے سینے سے لگا لیا جیسے وہ ان طوفانوں کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر یہ طوفان تو اور زیادہ تیزی کے ساتھ اٹھ رہے تھے۔ ان میں تو اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے بچے کو پہلے سے زیادہ زور کے ساتھ کھینچا، بچہ چیخ اٹھا۔ نجم نے مسکرا کر بچہ اس سے لے لیا۔ بچہ کتنی دیر تک شور مچاتا رہا۔ مگر نہ جانے بچے کے اس شور میں کیا مقناطیسیت تھی کہ شنو کا دل اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔

اس بچے نے اس کے فکر کا انداز ہی بدل ڈالا، یوں اس کے اندر دو سال کی اس قید نے جسے اس نے اطالیہ کے ایک قیدیوں کے کیمپ میں کاٹا تھا، زہرہ کی محبت کی آگ بڑی حد تک کم کر دی تھی۔ وہ ہفتہ میں دو بار خوب جی کھول کر شراب پیتا، اور کیمپ کی ہندوستانی اور انگریز قیدی نرسوں اور لیڈی ڈاکٹروں کے ساتھ خوش طبعی کرتا۔ زہرہ اس کو یقیناً کبھی کبھی یاد آتی۔

لیکن ان قیدی عورتوں نے۔ جو ان کے کمپ سے ملے ہوئے کمپ میں رکھی گئی تھیں یہ یاد بہت مدہم کر دی تھی۔ اور یوں بھی اس نے زمرد کے ساتھ محض پانچ راتیں کاٹی تھیں گو بڑی شاعری کی تھی گو بڑے وعدے وعید کئے تھے۔ گو بڑے ہنگامے اٹھائے تھے مگر ـــــ بہرحال اس کا مقابلہ اس نزہت کے ساتھ تو نہیں کیا جا سکتا تھا اس کے ساتھ تو اس نے پہلے، آٹھ سال کی عمر سے لے کر ۱۶ سال کی عمر تک پھر ۱۲ سال کی عمر سے لے کر پچھلے دو سال تک ایک عجیب وقت کاٹا تھا۔ اور گو کبھی جنسی کشش محسوس نہ کی تھی، نزہت نے کبھی اسے اکسایا ہی نہ تھا، کبھی اس کے دل میں خیال پرورش ہی نہ کیا تھا کہ وہ دونوں بھی میاں بیوی بن سکتے ہیں وہ تو یوں سمجھتے جیسے ایک ماں باپ کی اولاد ہوں۔ یہ خیال تو آج اچانک تھوڑی دیر پیدا ہوا۔ اور اس بچے نے، اسے اس طرح اچھالا، جیسے۔ وہ آسمان کو چھو لینے والا تھا۔

چھمی ابھی تک تھوڑے فاصلے پر کھڑی تھی۔ میجر سلیم۔ کئی دوسرے میجروں لفٹنٹ کرنیلوں کے ساتھ۔ دولہا میاں کی برات کے ساتھ گیا تھا۔ ابھی لوٹ کر نہ آیا تھا۔ چھمی فرصت کا یہ وقت منو کو چھیڑنے میں صرف کرنا چاہتی تھی اس نے منو کے سر کو جھکے ہوئے پایا تو ایک اور چوٹ کی

کیوں سرکار، وہ ـــــ چڑیاں چگ گئیں کھیت، والی مثل سنی ہے۔ یاد لیکر پٹیا کر والا محاورہ آپ کے گوش گزار کبھی ہوا ہے۔

جی ....

منو کا سر پہلے سے زیادہ جھک گیا۔ اور سورن نے اپنے دونوں ہاتھ

اس کے جھکے سر پر رکھ کر سرگوشی کی۔

دیکھئے۔ میجر مشتاق، میجر سلیم اور سب دوست ابھی ابھی لوٹ آئیں گے،

شائد زیادہ باتیں نہ ہو سکیں۔

ہیں بھی شائد۔

... نے لگے ہاتھوں ایک اور پھاڑ دی۔

... تو مجھے تم سے سخت ہمدردی ہے۔ زمرد گئیں۔ نزہت گئیں

یہ سورن بھی ...

اس کا تو شائد ... اس ظالم نے بھی تمہارے پیچھے ایک کرنل سے مسلمان

سے سول میرج کر لی ہے۔

اور میں بھی کچھ اسی قسم کی ... کرنے والی ہوں۔ ورنہ میں ہی تمہاری

کچھ سیوا کر دیتی۔

یہ کہہ کر ایک زور کا قہقہہ مارا۔ ایسا قہقہہ جس نے منو کے دل کو دو دھارے

چاقو کی طرح کاٹ ڈالا اور اس نے سوچا۔

وہ ہندوستان کیوں لوٹ کر آیا۔ کیوں نہیں وہیں رہ گیا۔ مگر وہاں کیسے رہ

سکتا تھا۔ لڑائی تو اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ وہاں رہ کر کیا کرتا۔

قیدیوں کا اطالوی کیمپ تو توڑ دیا گیا تھا۔ اتحادی کمانڈروں نے چار دن

پہلے اس علاقہ پر قبضہ کر لینے کے بعد انہیں بڑی عزت کے ساتھ رہا کیا تھا

ان کے گلوں میں پھول ڈالے تھے۔ ان کے اعزاز میں جشن منائے تھے دعوتیں کی

تھیں۔ اور دو سال کی پوری تنخواہیں جیب میں ڈال کر چھٹی دی تھیں کہ وطن

تشریف لے جائیں اور اپنے پیاروں سے مل کر ان کی اور اپنی خوشی میں اچانک اضافہ کریں۔ یہاں تو بات ہی اُلٹی ہو گئی تھی۔ یہاں تو چھمی کے قول کے مطابق سچ مچ چڑیاں چگ گئیں کھیت والی مثل صادق آگئی تھی۔

مگر پھر دفعتاً اس کا دماغ شعلے کی طرح بھڑک اُٹھا اور اس نے اپنا جھکا ہوا سر ایک بار پھر اوپر اُٹھا لیا اور چھمی کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔

چھمی۔ جہاں تک نزہو۔ اور سوزن کا تعلق ہے۔ تمہاری بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ مگر۔ زمرد کے بارے میں تم نے جو کچھ کہا ہے۔ مجھے ابھی اس کی تصدیق نہیں ہوئی۔

سوزن نے اس کی نگاہوں کا پیغام شائد سمجھ لیا تھا۔ اس نے۔ اس کے اوپر اُٹھے ہوئے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اور کسی قدر جھک کر کہنے لگی۔

منو خدا کی قسم۔ اگر تم اس وقت کہو۔ میں اسی وقت ولیم سلیم کو تمہاری خاطر چھوڑ سکتی ہوں۔ اور اگر تم آدھ گھنٹہ پہلے۔ یہی خواہش نزہو سے کرتے تو وہ بھی مجھے یقین ہے بریگیڈیر آفتاب احمد کو چھوڑ دیتی۔

باقی رہی زمرد اس کے متعلق مجھے کچھ ٹھیک معلوم نہیں۔

چھمی نے ایک اور تیر چھوڑا۔

جی ہاں۔ زمرد کے متعلق تو تب علم ہوتا جب وہ بھی اسی طرح دھوم دھام سے تمہاری آنکھوں کے سامنے بینڈ باجے کے ساتھ بریگیڈیر سلیم کے ساتھ اس گھر سے رخصت ہوتی۔

جی۔ لیکن وہ لوگ ایسے نہیں ہیں۔ ان میں نہ اتنا حوصلہ ہے اور نہ جرأت

اور مجھے تو خبر ملی ہے کہ بریگیڈیئر لقمان چھ مہینے کی رخصت لے کر کسی حسین وادی میں اپنی اس محبوبہ کے ساتھ ہنی مون منا رہے ہیں۔ جس نے منو کو دو سال پہلے اُلّو بنایا تھا اور جس کے تقدس کی قسمیں منو بہادر شاید آج بھی کھانے پر آمادہ ہوں۔

وہ اپنی جگہ سے اُٹھ بیٹھا۔ اس کے زرد زرد چہرے پر سیاہی چھا گئی چھمی نے یہ سیاہی دیکھی تو دو قدم آگے بڑھی۔ اور سورن کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

بھئی بڑے افسوس کی بات ہے۔ تم نے منو سے اس کی روئیداد تو سنی نہیں یہ تک نہیں پوچھا۔

حضرت دو سال کہاں تھے۔ یوں اچانک کیوں غائب ہو گئے۔ کیا ہم لوگوں کا امتحان مقصود تھا۔

سورن نے ابھی جواب میں کچھ کہا نہ تھا کہ دو لمبا دھن کو ان کے گھر تک پہنچانے والے احباب سے لدی موٹریں ایک کے پیچھے ایک لوٹ آئیں اور پھر ان سارے دوستوں نے منو کو یوں گھیرے میں لے لیا جیسے اس کے فرار کے ارادہ سے باخبر ہو گئے تھے۔

کرنیل رحیم نے اس کے چہرہ پر چھائی سیاہی، چڑھی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔ تو پوچھا۔

بھئی ابھی تو ہم تمہیں بھلا چنگا، چٹا سفید چھوڑ گئے تھے یہ تم نے ہمارے پیچھے اپنے چہرہ پر سیاہی کس طرح مل لی۔

چھمی نے آپ ہی آپ ترجمانی کی۔

واہ کرنل صاحب، آپ بھی نرے وہ ہیں۔ جانتے بوجھتے ایسی بات پوچھ رہے ہیں۔ جس کا جواب منو بے چارے کبھی نہ دے سکیں۔

یہ کوئی معمولی حادثہ تو نہیں گزرا بے چارے منو پر۔ دو سال کے بعد نہ جانے کیسی کیسی اُمیدوں سے یہاں پہنچے تھے اور یہاں آتے ہی، یہ اتنا بڑا حادثہ گزر گیا۔ ان کے دل کی رانی، ان کے سامنے دوسرے کی ہو کر ڈولی میں بیٹھ کر چلتی بنی۔

منو نے صرف اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت کتنا عجز تھا۔ سورن کا جی تڑپ اُٹھا۔ کرنل رحیم کو بھی ان آنکھوں کی مسکینیت پر بڑا رحم آیا، اور انہوں نے چھمی کی بات کو کسی قدر صحیح سمجھتے ہوئے ہمدردی کی۔

بھئی۔ اگر تم دو ایک مہینے پہلے آ گئے ہوتے تو شاید۔ یہ بات نہ ہوتی جو، اب ہوئی ہے۔

یہ بہر حال صبر سے کام لو۔

میجر سلیم نے لقمہ دیا۔

صاحب! صبر سے کام لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ منو میاں نے تو آپ تو بہت کو دھتکار کر اس زمرد بیگم کو ترجیح دی تھی۔ جو سنتے ہیں بریگیڈیر لقمان کے ساتھ رہتی ہے۔

میجر مشتاق احمد نے مداخلت کی۔

دیکھئے صاحب۔ اگر آپ لوگوں کا یہ انداز یہی رہا تو، ہم دونوں

واک آؤٹ کر جائیں گے۔

کتنی شرم کی بات ہے ایک دوست دو سال کی متواتر غیر حاضری بلکہ موت کے منہ سے نکل کر ہمارے پاس آیا ہے اور ہم نے۔ ایسی باتیں شروع کر دی ہیں جو ہمیں قطعاً زیب نہیں دیتیں۔

کرنل رحیم نے معذرت کی۔

میں میجر مشتاق ساتھیوں کی طرف سے معذرت کرتا ہوں۔ بہت بہت شرمندہ ہوں میری وجہ سے بات غلط رخ چل نکلی۔

چھمی کچھ کہنے کو تھی مگر سورن نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سازندوں سے درخواست کی۔

اندر تشریف رکھیں ساغر چھلکنے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔

پھر جو ساغر چھلکے ہیں۔ تو ہر ایک حتیٰ کہ منو تک کے ذہن کا رخ پلٹ گیا۔ کورس گایا جانے لگا۔ اور چھمی اور سورن ایک دوسری کی کمر میں ہاتھ ڈال کر یوں ناچنے لگیں۔ جیسے ناچنے کے سوا انہیں اس دنیا میں اور کوئی مصروفیت نہ تھی۔

سلمیٰ رحمان اور انوری تالی پیٹ رہی تھیں اور میجر سلیم، کرنل رحیم کیپٹن ابو سعید، مسٹر ہادر، نعیم الرحمان اور دوسرے ایک عریاں گیت گانے لگے تھے۔

ان سب میں سوائے میجر مشتاق کے کوئی دوسرا ہواس میں نہ تھا۔ کتنی رات گئے۔ جب میجر مشتاق احمد نقشبندی کرنل منو کو اپنے جسم کا سہارا دے کر موٹر میں ڈال کر چلا تو منو نے لڑکھڑاتی لڑکھڑاتی زبان میں اس سے خواہش کی۔

بھی۔ دو سال سے کسی ہندوستانی فن کار کو گاتے نہیں سنا ذرا موٹر کا رخ ادھر پھیرو . . . . . .

مشتاق نے موٹر کا رخ ادھر پھیر دیا۔ یہ بازار اس وقت قریب قریب ویران پڑا تھا۔ جب ان کی موٹر وہاں آئی۔ کہیں کہیں اوپر کی منزلوں میں بتیاں جل رہی تھیں مشتاق نے ایک ریڈیو سنگر کے بالاخانہ تک منو کی راہ نمائی کی۔

یہ ریڈیو سنگر مس نسیم۔ یوں تو سانولی سی رنگت کی تھی لیکن اس کی آواز میں بلا کی مٹھاس تھی۔ وہ گاتی جاتی اور۔

منو کو ایسا محسوس ہوتا جیسے، یہ کوئی جادوگر ہے۔ اس کا نشہ پہلے سے کم ہو گیا تھا۔ وہ جب نسیم پر نوٹوں کی بارش کرتا اور نسیم کی چھوٹی بہن شمیم۔ ان نوٹوں کو چن چن کر استاد جی کی زنبیل میں ڈالتی تو منو کا جی بہلتا۔ وہ ایک ساتھ اس زنبیل کو بھر دے لیکن اس نے یہ زنبیل ایک ساتھ نہیں بھری ہوتے ہوئے اسے اوپر کو ابھارا۔

تین بجے کے قریب۔ یہ زنبیل بھر گئی۔ اور نسیم کی آواز اس طرح رکنے لگی، جیسے اس کے گلے میں کوئی چیز اٹک گئی تھی۔ مشتاق سمجھ گیا اور محفل برخاست کرنے کی اجازت چاہی۔ نسیم گو رک گئی تھی سازندے آرام کرنے لگے تھے۔ مگر اس نسیم کا جی چاہ رہا تھا یہ لوگ یہاں سے نہ جائیں۔ یہ تو دولت کی کان تھے اور انھوں نے آج دو گھنٹے میں اتنے روپے اسے دئے تھے۔ جتنے کسی نے دئے نہ تھے۔ اس نے سازندوں کو رخصت کر کے، ان دونوں کو روک لیا۔ اور اپنی نیند بھری لانبی آنکھوں میں ساری جوانی بھر کر درخواست کی۔

اگر ناگوار نہ ہو۔ تو میرے ساتھ دو لقمے کھالیں۔

ان کو ناگوار کیسے ہو سکتا تھا خصوصیت سے میجر شستان کو تو اس کی یہ خواہش بہت ہی بھلی معلوم ہوئی تھی۔ وہ تو شمیم سے اٹک گیا تھا۔ شمیم کی الھڑ جوانی، اس کی لانبی لانبی آنکھیں، اد پر کو ابھرا ہوا سینہ۔ اور بھرے بھرے بازو اس سے کوئی عجیب بات کہہ رہے تھے۔

کھانے کا تو بہانہ تھا۔ نسیم ان دونوں کو پہلے سے زیادہ بے خود بنانا چاہتی تھی۔ اس نے وائٹ ہارس کی ایک بوتل ان کے سامنے کھول کر رکھ دی تھی اور وہ دونوں نسیم اور شمیم کے ساتھ اس بوتل کو اس طرح خالی کر رہے تھے جیسے برسوں نہیں پی تھی۔

وہ رات گیا، اگلا آدھا دن ان دونوں نے وہیں کاٹا۔ اور جب رخصت ہوئے تو رات کو پھر آنے کا وعدہ کر گئے۔ مگر وہ جب گھر پہنچے تو وہاں۔

چھمی اور سورن بیٹھی ان کی راہ تک رہی تھیں۔ چھمی نے انکے آتے ہی، رات کا موضوع پھر چھیڑا اور ایک بار پھر منو کی غیرت کو جگانے کی کوشش کی مگر منو ابھی تک اس لذت کے مزے لوٹ رہا تھا جو اس پتلی دبلی نازک نازک سا جسم رکھنے والی نسیم نے اسے عطا کی تھی۔ چھمی کی بات پر توجہ دیئے بغیر اس نے سورن سے پوچھا۔

سورن، ہم نے تو طے کر لیا ہے کہ ہم کسی گانے والی سے سول میرج کر لیں

چھمی نے پھر چوٹ کی۔

معلوم ہوتا ہے۔ یہ پروگرام رات بنا۔ اور اب آپ غالباً وہیں سے

تشریف لا رہے ہیں۔

ہاں بیٹی جب شریف عورتیں اس طرح بے وفائی کرنے لگیں جیسا کہ نزہت، سورن اور زمرد نے کی۔ تو پھر۔

سورن نے اسے ڈانٹا۔

میں کہتی ہوں چھمی، آدمی بن جاؤ، ورنہ۔

چھمی چہکی۔

ورنہ تم مجھے کسی کرنتے مسلمان سے زبردستی بیاہ دوگی۔

اور میں تو خدا کی قسم ایسے بیاہ پر کبھی تھوکوں بھی نہیں۔

پھر سورن پر برسی۔

میں تو سوچتی ہوں، خدا جانے تمہاری عقل گھاس کھا گئی ہے۔ کہ تم اس کرنتے سے بیاہ کر رہی ہو۔ نہ شکل نہ صورت۔ نہ علم نہ ہنر آخر تمہیں اس کی کیا بات پسند آگئی ہے۔

اس سے تو یہی بہتر تھا کہ کنواری بیٹھی رہتیں اور اب تو منتوا ہی گئے ہیں اگر تم کنواری ہوتیں تو منتو بے چارے گانے والیوں سے شادی کرنے کی کیوں سوچتے تم ہی سے نہ دو بول پڑھا لیتے۔

سورن نے اسے ڈانٹا!

دیکھو میں کہتی ہوں، تم حد سے تجاوز کرنے کی عادت چھوڑ دو۔ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔

چھمی نے بہت زور کا قہقہہ مارا۔ اور سورن کے بالوں میں انگلیاں

الجھاتے ہوئے کہنے لگی۔ بھئی۔

بھئی ہمیں ڈراؤ دراؤ نہیں۔ ورنہ ہم بھی منو کی طرح کسی گانے ناچنے والے سے بیاہ کریں گے۔

سورن نے بددعا دی۔

خدا کرے تمہاری زبان میں کیڑے پڑیں۔ جو چپ رہنا نہیں جانتی۔

منو! کا ذہن، ان کی اس گفتگو سے کسی قدر الجھ گیا تھا اور وہ سوچنے لگا تھا کیا نسیم سے بیاہ اس کے لئے سودمند نہ ہو گا کیا یہ عورت بھی اسے اسی طرح فریب دے گی جس طرح زمرد نے دیا۔ کل رات کے بعد پہلی بار زمرد اس کے ذہن پر مسلّط ہوئی، اور اسے اچانک یاد آیا۔ اس زمرد نے آخری خط جو اس کے نام لکھا تھا۔ اس میں تو نعمان کی بے حد تعریف کی تھی اور کہا تھا وہ مجھ سے محض اس لئے دور چلے گئے ہیں کہ انہیں اندیشہ تھا شائد میرے ساتھ رہ کر۔ وہ اس امانت میں خیانت کر دیں جو آپ انہیں سونپ کر گئے تھے۔

اس کے آخری الفاظ تھے۔

ایسا کردار۔ نہ کبھی دیکھنے میں آیا نہ سننے میں۔

منو کو یہ الفاظ کیا یاد آئے اس کا جی چاہا۔ وہ اُڑتا ہوا اس شخص کے پاس پہنچ جائے جسے دوستی کا اس قدر پاس تھا۔

وہ شرابی ہی تو تھا۔ ذہن کا رُخ کیا پلٹا، سارا پروگرام ہی بدل گیا۔ وہ لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ ٹیلیفون اسٹینڈ کے قریب آیا۔ ریسیور اٹھا کر ایرو ڈروم کا نمبر ملایا اور راولپنڈی کی طرف اُڑنے والے ہوائی جہازوں کا وقت دریافت کیا۔

چھمی وہیں بیٹھی بیٹھی چیخی ۔

میں کہتی ہوں ، راولپنڈی جانے کی نیت نہ کرو ۔ ورنہ ایسی منہ کی کھاؤ گے کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا ۔ یوں تم اگر چاہو ۔ تو ہم دونوں میں سے کوئی ایک تمہارے لئے گنجائش نکال لے گی ۔

منو نے اس کی بات پر دھیان نہیں دھرا ۔ اور آرڈر دیا ۔

چھ بجے جانے والے ہوائی جہاز سے ایک سیٹ بک کریجئے ۔ لفٹنٹ کرنیل منور احمد خاں کے لئے ۔

اور ادھر سے جب آرڈر کی تعمیل کی اطلاع ملی تو اس نے رسیور رکھ کر مشتاق کو آواز دی !

مشتاق بھئی ۔ ذرا ہمارے ساتھ بازار تو چلو ، زمرد کیلئے کچھ خریدیں گے ۔

چھمی نے ایک بار اور طنز کی ۔

تم سمجھتے ہو ۔ زمرد کوئی ننھی بچی ہے جو تمہارے تحفوں سے کھیلنے لگے گی اور تم سے کھیے گی ۔

تم بڑے اچھے ہو ۔ جو اتنی دور سے اس کے لئے یہ کھلونے لائے ہو ۔

بے وقوف نہ بنو ۔ اس عورت کے لئے جس کے ساتھ تم نے صرف چند راتیں کاٹیں ۔ اپنے ان قدیم ساتھیوں کو نظر انداز نہ کرو ۔

پچھتاؤ گے ۔

منو کا اشتیاق اور تیز ہوا ۔ اور اس نے مشتاق سے کہا ۔

مشتاق بھئی ۔ میرے منہ کی طرف کیا دیکھتے ہو ۔ جلدی سے چل دو ۔

مشتاق نے ان دونوں مہمانانِ عزیز کی طرف دیکھا۔ اور پوچھا۔

لیکن یہ دونوں۔

چھمی نے چوٹ کی۔

یہ دونوں تو پرانا اسٹاک ہیں۔ ان کی کیا بات ہے۔ ان کی منّو کو اگر پرواہ ہوتی تو منّو اس چڑیل کے ساتھ فراری کیوں اختیار کرتے۔

منّو کا پارہ چڑھنے کو تھا لیکن سورن کی مداخلت نے اسے پھر نیچے گرا دیا۔ سورن نے چھمی کو ڈانٹا اور اسے بازو سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لے گئی۔ اس وقت خدا جانے سورن کی آنکھوں میں کیوں آنسو چھلک آئے تھے۔

پندرھواں باب

مشتاق، سورن اور چھمی، اسے ایروڈرم پر چھوڑنے آئے۔ گو اس نے خوب پی رکھی تھی۔ وہ سخت نشے میں تھا لیکن اس نے ان سب سے اس طرح رخصت لی، جیسے وہ اس دفعہ پھر کسی بڑے محاذ پر روانہ ہو رہا تھا۔

سورن کی آنکھوں میں اس وقت بھی آنسو تھے۔ جب وہ ہوائی جہاز کی سیڑھیوں پر چڑھا۔ پھر جب اس کا جہاز فضا میں اڑنے لگا تو وہ بچوں کی طرح رونے لگی تھی۔ اور چھمی اس کو بار بار تسلی دے رہی تھی۔

اطمینان رکھو۔ وہ کل ہی لوٹ آئے گا۔ زمرد اسے منہ نہیں لگائے گی وہ تو اس پر تھوکے گی بھی نہیں۔

لیکن سوزن جانتی تھی زمرد ایسی عورت نہیں ہے۔ اس کا دل کسی طرح نہ بہلا۔
اور اس نے چھمی سے خواہش کی۔ چلو کسی ایسی جگہ چلیں جہاں بیٹھ کر ہم دونوں
بچوں کی طرح رو سکیں۔

چھمی کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ اور اس نے منہ پھیر لیا۔

دہلی سے راولپنڈی کی پرواز محض تین گھنٹہ کی ہے۔ مگر یہ تین گھنٹے اس
شرابی منو کے لئے تین سال سے بھی لمبے ہو گئے تھے کٹنے ہی میں نہ آتے تھے۔

نہ جانے کیا بات تھی وہ جس وقت جہاز سے اترا۔ اس کا دل آپ ہی آپ بیٹھنے
لگا۔ اس کا وہ شوق جو اسے یہاں لایا تھا آپ ہی آپ اندر پڑتا گیا یہ شوق تھا اس وقت
تو ایک عجیب اضطراب میں بدل گیا جب ٹیکسی ڈرائیور نے اس سے پوچھا۔

سرکار کہاں لے چلوں۔

اور اس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے جواب دیا۔

میاں وہیں لے چلو جہاں تم لے جا سکتے ہو۔

ٹیکسی ڈرائیور ایسی کئی جگہوں سے واقف تھا جہاں میجروں، لفٹنٹ، کرنیلوں
اور دوسرے فوجی افسروں کو لے جایا جا سکتا تھا۔

یہ نہ تو ہوٹل تھا نہ کوئی سرائے۔ یہ تو ایک پرائیوٹ قحبہ خانہ تھا۔ جہاں اس
ٹیکسی ڈرائیور نے منو کو لا اتارا۔ اور یہاں شراب بھی تھی رقص بھی تھا اور رسائی بھی۔

یہ رات بھی یوں ہی کٹ گئی۔ دوسرے دن اس کی آنکھ اس وقت کھلی جس
وقت کل کھلی تھی بارہ بج رہے تھے۔ اور اس نے ایک بار پھر رخت سفر باندھا۔
راولپنڈی سے ٹیکسی لی۔ اور حویلیاں آیا۔ مگر حویلیاں پہنچ کر پھر اس کا شوق اسی

طرح ماند پڑ گیا جیسے کل پڑا تھا اور وہ الجھے الجھے دماغ سے سوچنے لگا۔ اگر سچ مچ، زمرد نے نقمان کو اس پر ترجیح دے دی ہو تو پھر کیا ہوگا۔ نقمان اس کا دوست تھا وہ دوست جس نے۔ اس کی اس وقت مدد کی تھی جب کوئی دوسرا نہ کر سکا تھا۔ اس دوست نے اس کی خاطر کتنی بڑی قربانی کی تھی۔ اس وقت تک اس کی امانت میں خیانت نہ کی جب تک اس کے گم ہونے کی خبر نہ اُڑی۔

مگر پھر اس نے سوچا ممکن ہے۔ نقمان نے اب بھی خیانت نہ کی ہو۔ اب بھی وہ اور زمرد اسی طرح رہ رہے ہوں جیسے دو سال پہلے رہتے۔

اس خیال نے اسے ڈھارس بندھائی۔ اور اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

مجھے چھاؤنی لے چلو۔

چھاؤنی میں گو اسے کوئی جاننے والا نہ تھا۔ البتہ۔ جب اس نے بریگیڈیئر نقمان کا پتہ پوچھا۔ تو بریگیڈ کے اسٹاف نے اس کا اس طرح خیر مقدم کیا جیسے وہ کوئی ان کا سب سے بڑا افسر تھا۔

یہیں اسے بریگیڈیئر نقمان کے پاگل پن کی خبر ملی اسپین کے کرنل دگ نے اس سے اس ہولناک عذاب کی تفصیل کہی جس میں بریگیڈیئر نقمان مبتلا تھے۔ وہ منو اور زمرد کے تعلقات سے آگاہ نہ تھا۔ ورنہ وہ شائد منو کے سامنے یہ باتیں نہ کہتا۔ نہ جانے بریگیڈیئر صاحب کے غم کی یہ باتیں خود کرنل دگ کیلئے اس درجہ رنج دہ کیوں تھیں کہ وہ بریگیڈیئر صاحب کی اس نرالی اور انوکھی محبت کے قصے کہتے کہتے بچوں کی طرح رو دیا۔ اس لمحہ منو کی اپنی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ جب کرنل دگ نے رُکتی رُکتی آواز میں کہا۔

وہ اس عورت سے محبت کرتے ہیں جو ان کے کسی دوست کی محبوبہ ہے۔

حالانکہ وہ دوست زندہ نہیں مر چکا ہے۔ لیکن جب بھی یہ عورت ان کے قریب آن کر، اپنے ہاتھ ان کے ہاتھوں پر رکھتی ہے۔

وہ دیوانہ وار چیخنے لگتے ہیں۔

خدا کے لئے پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں نہیں چاہتا منّو کی امانت میں خیانت کر لوں، پرے ہٹ جاؤ ورنہ میں اپنے سینہ میں گولی مار لوں گا۔

وہ ہر وقت بھرا ہوا پستول اپنے قریب رکھتے ہیں اور جب بھی وہ خوبصورت عورت ان کے قریب آتی ہے۔ وہ ریوالور کی نالی اپنے سینہ کی طرف کر لیتے ہیں۔

اور وہ عورت روتی ہوئی پیچھے بھاگ جاتی ہے اور اپنے بال اس طرح نوچتی ہے جیسے پاگل۔

منّو زندان تھا، وہ اتنی ہولناک داستان سن کر خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اور کرنیل وِک کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چیخا۔

کرنیل صاحب میں ہی وہ بدنصیب دوست ہوں جس نے بریگیڈیر صاحب کو اس عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔

خدا کے لئے ان تک مجھے جلد لے چلئے۔ میں آپ اس عورت کو ان کے قدموں میں جھکا کر کہوں گا۔

یہ مادرِ گیتی کروڑوں منّو روز پیدا کر سکتی ہے۔ مگر نعمان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

کرنیل رِک کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ منّو کو جب ایک فوجی گاڑی میں اپنے ساتھ بٹھائے کاغان وادی کی طرف بڑھ رہا تھا اسے ایسا

کے جسم کو نہیں چھوا ۔ ہمیشہ دیویوں کی طرح اس کا احترام کیا ۔

منّو میں اس سے زیادہ کچھ سننے کی ہمت نہ تھی ۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا، کرنل صاحب نے اشارہ کیا اسے سہارا دیں ۔ ان کے سہارے وہ اندر کمرے میں آیا جہاں، ایک طرف بریگیڈیئر نعمان کی خون میں تر بہ تر نعش پڑی تھی اور دوسری طرف زمرد بیگم کی
منّو نے ان سب کے سامنے ۔ اپنا سر ان کے پاؤں پر رکھ دیا ۔ جو اس انسان کے پاؤں تھے جس کا کردار پیغمبروں اور دیوتاؤں کا سا تھا ۔

بریگیڈیئر صاحب کی آخری وصیت کا پورا احترام نبھایا گیا ۔ چھاؤنی میں ان کی موت کی خبر کئی دن بعد پہنچائی اور وہ بھی اس طرح کہ کسی کو اس بات کا وہم و گمان تک نہ ہوا
منّو امی ایریئے میں کرنل ہے وہ اس واقعہ کو قریب قریب ہر روز بھولتا ہے ۔ اور ہر روز یاد کرتا ہے ۔

چھٹی دہلی سے اس کے پاس آگئی ہے ۔ وہ دونوں رات رات بھر شراب پیتے ہیں اور کبھی کبھی جب چھٹی اس سے کہتی ہے ۔

بس نہیں کہتی تھی زمرد کو اس کے حال پر چھوڑ دو ورنہ ایسی چوٹ کھاؤ گے کبھی زخم نہیں بھرے گا ۔

وہ سر جھکا لیتا ہے اور اس کی آنکھیں گنگا جمنا جیسی روانی سے بہنے لگتی ہیں ۔

اور میں نے پاکستان بننے کے بعد جب دادی کا مکان میں ان دونوں کی قبر پر فاتحہ پڑھی جو ان کردار کے حیرت انگیز نمونے تھے تو میں آپ گھنٹوں پیا روتا رہا تھا منور دیا کرتے ۔

رشید اختر ندوی

رئیس احمد جعفری کے دو دلچسپ سوشل ناول

درد

۔ رد کی کہانی پردۂ فلم پر بھی آ چکی ہے جو کافی مقبول ہوئی۔ حسن، دولت، خودداری

نان کو جعفری نے اپنی کہنہ مشقی سے بے حد موثر بنا دیا ہے۔

قیمت ڈھائی روپے

ندھا

قعی اندھا تھا ؟

جو

ن کے آگے کبھی سرنگوں نہ ہوا۔ کالج کی حسین و جمیل طالبات

کا یہ محبوب پروفیسر اُن کے لئے معمہ بنا رہا۔ خود بے حد شکیل ہونے کے

باوجود حسن سے بیزار رہنے والے پروفیسر کے نظریات کو سمجھنے

کے لئے "اندھا" ضرور منگوائیے۔

قیمت تین روپے (۳ ر)